(افسانوں کا مجموعہ)

آگے راستہ بند ہے

حسن رہبر

حسن رہبر

ایک پل کا فاصلہ	افسانوی مجموعہ	۱۹۸۹ء
چسکا	افسانوی مجموعہ	۲۰۱۲ء
ہر بوند سمندر	افسانوی مجموعہ	۲۰۱۵ء
آگے راستہ بند ہے	افسانوی مجموعہ	۲۰۱۶ء
بند مٹھی کا سچ	غزلوں کا مجموعہ	زیر ترتیب

آگے راستہ بند ہے

(افسانوی مجموعہ)

حسن رہبر

بُک کارپوریشن، دھلی۔۶

اس کتاب کی اشاعت میں محکمہ راج بھاشا اردو ڈائرکٹوریٹ حکومت بہار کا مالی تعاون شامل ہے

AAGE RASTA BAND HAI (Short Stories)
by
Hasan Rahber

Ashraf Building, Hossainabad,
Bhagalpur - 812005 (Bihar)

Year of Edition 2016
ISBN 81-88912-69-7
₹ 150/-

نام کتاب	:	آگے راستہ بند ہے (افسانوی مجموعہ)
مصنف و ناشر	:	محمد ابرار الحسن
قلمی نام	:	حسن رہبر
ولادت	:	۱۴؍مارچ ۱۹۴۲ء
پتہ	:	اشرف بلڈنگ، حسین آباد، بھاگلپور۔۸۱۲۰۰۵ (بہار)
		موبائل ● 7091165512 ● 8271107036,
سن اشاعت	:	۲۰۱۶ء
قیمت	:	۱۵۰ روپے
تعداد	:	۶۰۰
زیر اہتمام	:	مکتبۂ کوہسار، بھیکن پور۔۳، بھاگلپور۔۸۱۲۰۰۱ (بہار)
مطبع	:	روشان پرنٹرس، دہلی۔۶

BOOK CORPORATION
3191, Ground Floor, Mirza Ahmad Ali Marg
Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (INDIA)
Ph: 23216162,23214465 Fax: 0091-11-23211540
E-mail: ephdelhi@yahoo.com

انتساب

ارشد رضا کے نام

ترتیب

دیکھی ان دیکھی

جب مجھے گرد و پیش میں ہونے والی تبدیلیوں کا ادراک ہوا اور میری آنکھیں بدلتے موسموں کی تجلیوں سے روشناس ہوئیں تو میں نے اپنے اندر اتر کر دیکھا۔ اور تب مجھ پر ایک نئی دنیا کا انکشاف ہوا۔

سوچتا ہوں تو لگتا ہے۔ وہ بھی کیا دن تھے۔ جب جینا آسان تھا۔ سبزیاں گھی میں بنائی جاتی تھیں اور کھانا بنانے کے لئے مٹی کے برتنوں کا استعمال ہوتا تھا۔ کھیتوں کی ہریالی من کو بھاتی تھی۔ پھول اور پھلوں کی خوشبو سے کمرہ معطر رہتا تھا۔ ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک لوگ سکھ اور شانتی کے ماحول میں خوشگوار زندگی جی رہے تھے۔

لیکن یہ سچ ہے کہ آج سمندر ایک کوزے میں سما گیا ہے اور دنیا سمٹ کر مٹھی میں آ گئی ہے۔ لیکن زمانے کی ستم گری دیکھئے کہ آج ہر کوئی بے حال ہے۔ کوئی کسی کو نہیں پوچھتا۔ سب کو اپنی اپنی فکر پڑی ہے۔ کہیں بھائی بھائی کا حق مار رہا ہے تو کہیں کوئی اپنے پڑوسی کا گھر جلا رہا ہے تو کوئی چھین رہا ہے۔ معصوم بچے اور بچیوں کے چہرے کی مسکراہٹ۔ لاعلاج بیماریوں کے شکار لوگ تڑپ تڑپ کر مر رہے ہیں۔ لیکن نہ مرض کی پہچان ہے اور نہ علاج کی سہولت میسر۔ روزی روٹی کے مسائل ہیں۔ غربت اور افلاس نے زندگی اجیرن کر رکھی ہے۔ دہشت گردی اور تخریب کاری نے جہاں آدمی کا جینا مشکل کر دیا ہے وہیں اس سے نمٹنے کے طور طریقوں کو بھی قابل بھروسہ رہنے نہیں دیا گیا۔

جب حالات سے نمٹنے کی آدمی میں سکت نہیں رہتی اور دل بغاوت پر آمادہ ہوتا ہے تو قلم اس کا سہارا بن جاتا ہے۔ اتہاس کے پنّے اس بات کے گواہ ہیں کہ مایوس کن فضا اور اضطراب انگیز لمحوں کی مشکل گھڑی میں جب بھی مظلوموں کی فریاد ایوان کے در و بام سے ٹکرائی ہے تو قلم نے ان آہوں کا ساتھ دیا ہے اور ایک نئی عبارت لکھی گئی ہے۔ زمانہ ہمیشہ قلم کے آگے سرنگوں رہا ہے۔

روایت تو ارتقائی عمل ہے اور تبدیلی فطرت کا تقاضا۔ وقت بدلتا ہے تو الفاظ کے معنی بھی بدل جاتے

ہیں اور بے جان الفاظ کو زبان مل جاتی ہے اور گزرتے ہوئے لمحات کی کھلی آنکھوں کا خواب سچ دکھائی دینے لگتا ہے۔

زمانے کی نئی نئی کھوج، نئے نئے انکشافات اور ایجادات کا انسانی سوچ وفکر پر اثر انداز ہونا تو ایک فطری امر ہے۔ ہر زمانے، ہر معاشرے میں نئے رجحانات کو جگہ ملی ہے۔ نئی سوچ، نئے خیالات اور نئے فکری زاویے نے ذہن کے دریچے کھولے ہیں۔ اور نئے تجربوں کی حرارت سے زندگی نے عروج پایا ہے۔

آج زندگی ایک بار پھر سوالوں کے گھیرے میں آگئی ہے۔ آدمی دولت کی ہوس میں اس کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ نہ حلال وحرام کی تمیز اور نہ انسانیت کا پاس۔ کیا ہوگا اس فساد اور فتنے کا انجام۔ کون کس سے پوچھے۔ کون دے گا جواب۔ جانتے تو سبھی ہیں پر لبوں پر سب کے مہر لگی ہے۔

جب ڈوبتی ہوئی شام کی سرخی مائل کرنیں، ابھرتی ہوئی صبح کی سپیدی سے ٹکراتی ہیں تو بدلاؤ کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ وقت کے مزاج اور حالات کے تغیرات کا اثر ادب پر پڑنا بھی لازم تھا۔

ادب اور زندگی کے رشتے۔ سماجی، سیاسی اور تہذیبی روابط۔ افسانوں میں زبان و اسالیب کی تبدیلیوں کا باعث بنے۔ جس سے اس عہد کے مزاج کی عکاسی سامنے آئی۔

آج زبان اپنا رخ بدل چکی ہے۔ آدمی کے غور وفکر کا پیمانہ بدل گیا ہے۔ اور لب ولہجے میں بھی سوز وگداز کی ایک الگ ہی کیفیت ہے۔ ہمارا رشتہ ماضی کی روایتوں سے ٹوٹ کر ایک نئی روایت کی طرف بڑھ رہا ہے۔

افسانوں نے کئی منزلیں طے کیں۔ ہر دور کے ذی شعور فنکاروں نے اپنے ہم عصر تخلیق کاروں کی رہنمائی کی۔ آس پاس کے ماحول پر اپنے اثرات مرتب کئے۔ ہر آغاز کا انجام تو طے ہے۔ نتیجے میں ایک دور کے فکری زوال کے بعد اس کی کوکھ سے دوسرے نظریے نے جنم لیا اور پھر لمحوں کی گرفت میں نئی نئی کڑیاں جڑتی چلی گئیں۔

فنکار تو اپنے عہد کا ترجمان ہوتا ہے۔ اس کے اندر ہواؤں کے رخ کو بدلنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ میرے افسانوی سفر کے دوران کئی ادبی جھونکے آئے۔ میں نے ترقی پسند تحریک کا آغاز بھی دیکھا اور اس کا انجام بھی۔ پھر جدیدیت کی جلدہ گری بھی دیکھنے کو ملی۔ اس نئی آواز سے بہت سارے مصنفین

متاثر ہوئے اور بڑے پیمانے پر اس کے زیر اثر کہانیاں لکھی گئیں۔ کچھ دانشوروں نے ادب کے اس رجحان سے اپنی بیزاری کا بھی اظہار کیا۔لیکن زیادہ تر دانشوروں نے کھل کر اس کی حمایت کی۔

لیکن تجریدیت اور علامت نگاری سے افسانوی ادب کا وقار ضرور مجروح ہوا۔ بے جا تشبیہات اور بے محل استعارات اور بے معنی کنائے کی زبان کو عام قاری کے ساتھ سنجیدہ قاری نے بھی مسترد کر دیا۔ رفتہ رفتہ اس کے پیروکار بھی اس سے اوب گئے اور کنارہ کشی اختیار کر لی۔

اس کے بعد عرصہ تک خاموشی رہی۔ ادب پر جمود طاری رہا۔ اور یہ خاموشی پیش خیمہ بنی۔ ایک نئے ادبی رجحان کی آمد کی۔

جدیدیت کی جلوہ گری کے بعد مابعد جدیدیت کا مظاہرہ بھی سامنے آیا۔لیکن ان میں نہ وہ شدت تھی اور نہ وہ جوش وجذبہ جو ترقی پسند ادیبوں سے مخصوص تھا۔غرض کہ نامعلوم سمتوں کا سفر، بے نام تجربے کی دھند میں کھو کر خوش فہمی، خود فریبی اور انتشار کا شکار ہو کر رہ گیا۔

فنکار جب وجدانی کیفیت سے شرسار ہو کر لکھتا ہے تو اسے نہ صلے کی تمنا ہوتی ہے اور نہ ستائش کا خیال۔ وہ تو کینوس پر بکھری اپنی کہانیوں میں زندگی کے رنگ بھرنے میں ایسا منہمک رہتا ہے کہ بعض اوقات اسے اپنے آپ کی بھی خبر نہیں ہوتی۔ اور اس کی تحریروں میں بے ساختگی، بے باکی اور ایسی حق گوئی آجاتی ہے کہ اس کے ارادے کبھی متزلزل نہیں ہوتے۔ اسے نہ زمانے کی بے وفائی کا خوف ہوتا ہے اور نہ اپنوں کی ایذا رسانی اس کے قدم ڈگمگاتی ہے۔ وہ اس بات سے بخوبی واقف ہے کہ فنکار کبھی مرتا نہیں۔ اس کا فن اسے ہمیشہ زندہ رکھتا ہے۔

وقت نے کروٹ لی۔ اور کہانی نئے طرز احساس کے ساتھ ایک بار پھر اپنی روش پر چل پڑی۔ جو رشتے کی پرانی لکیروں سے ہٹ کر آدمی کو زندگی کے نئے تقاضوں سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ دیتی ہے۔ کھلے ذہن، کھلی فضاؤں میں اپنی تمام روایتی شان وشوکت کی رعنائیاں سمیٹے ہوئے۔

ذاتی تجربے، سمجھداری اور تخلیقی صلاحیتوں سے کہانی میں حقیقت کے جلوے بکھرتے ہیں۔ اور فلسفۂ حیات کا جو تصور سامنے آتا ہے اس سے آدمی زندگی کا رمز شناس تو ہوتا ہی ہے کہانی کو ایک نئی جہت بھی ملتی ہے۔

میں نے ہر موقع پر افسانوی ادب کی بے راہ روی سے خود کو بچائے رکھا۔ اور اپنی ایک الگ راہ بنائی۔ میں کہانیوں میں جمالیاتی مشاہدے کی گرمی اور اس کی ہمہ گیری کا قائل ہوں۔ اور زندگی کی ننگی حقیقت کو کہانی کے روپ میں ڈھالنے کی جو کوشش کی ہے اس میں صالح اور تعمیری ادب کی پاسداری کا خیال رکھا ہے۔

ہر کہانی کار کا ایک نظریہ ہوتا ہے جس کے تحت وہ کہانیوں کے تانے بانے بنتا ہے۔ میں نے گہری معنویت کے ساتھ ادب میں مقصدیت کو راہ دی ہے۔ انسانیت۔ اس کی حفاظت و بقا کو اپنا نصب العین بنایا ہے۔

میں نے زندگی کو اجتماعی حیثیت سے دیکھا ہے۔ میرا نظریۂ حیات میانہ روی اور اخلاقی قدروں سے مزین ہے۔ میں نے حقائق کو تجربے کی تہہ داریوں کے ساتھ برتا ہے اور کہانی کو زبان دی ہے۔ میری کہانیوں نے انسانی فطرت کی آئینہ داری بھی کی ہے اور زندگی کے فلسفے کی عکاس بھی ہے۔

عہد حاضر کی سماجی ناہمواری، سیاسی بدنظمی، طبقاتی کشمکش اور جبر و تشدد کے خلاف احتجاج کو بھی میں نے کہانیوں میں جگہ دی ہے۔ اور کہانی کے وسیلے سے ہی انسانی رویے کی مذموم حرکتوں کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے اور اخلاقی قدروں کی گرتی ہوئی ساکھ کے بخئے ادھیڑے ہیں۔ میں نے سماج کے بدلتے رجحانات، پرانی قدروں کی شکست و ریخت اور لسانی مسائل کو بھی اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا ہے جن میں احساس کی نیرنگیاں ہیں، مشاہدے کی آنچ اور حقیقت بیانی کی سحر آفرینی بھی۔ منطقی اور تخلیقی ربط کے حسن عمل سے ہی کہانیوں میں ماجراتی اور تجسس آمیز کیفیت پیدا ہوتی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک افسانہ نگار انسانی کردار کی نفسیاتی تہوں میں اتر کر اس کے جذبات و کیفیات کو کہانی کا روپ دیتا ہے۔ اس کے انداز فکر کی ندرت، فنی بصیرت کی جدت اور اظہار خیال کی توانائی ہی اسے کامیابی سے ہمکنار کرتی ہے۔

مجھے پتہ نہیں کہ میری کہانی کی یہ خوبی ہے یا خامی۔ کہ جب کہانی اپنے اختتام کی طرف بڑھتی ہے تو وہ کہانی کار کو اپنی گرفت میں ایسا لے لیتی ہے کہ کہانی کار خود کہانی کے کردار میں ڈھل کر اس کا ایک حصہ بن جاتا ہے۔ جو قاری کے ذہن کو منتشر ہونے نہیں دیتا۔ اور آخر تک اس کا رشتہ نفسِ مضمون سے جوڑے

رہتا ہے۔

قاری جب میری کہانیوں سے گذرتا ہے تو اس کی ایک سوچ بنتی ہے اور آگے چل کر وہ اپنی سوچ کے مطابق کہانی کا نتیجہ طے کرتا ہے۔ میں اپنی کہانیوں کو ہمیشہ ایک نیا رخ دینے کی کوشش کرتا ہوں اور ایک نئے تیور کے ساتھ کہانی اختتام پذیر ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قاری جب کہانی ختم کرتا ہے تو انجام پڑھ کر چونک اٹھتا ہے کہ یہ کیا ہوگیا۔ اس نے جو سوچا تھا ویسا ہوا تو کچھ بھی نہیں۔ اور یہی میری کہانیوں کی خصوصیت ہے اور شاید میری پہچان بھی۔

میری اس انفرادیت کا اعتراف ہر مکتبۂ فکر کے دانشوروں نے کیا ہے۔ اور میں اِن کا شکر گزار ہوں۔

حسن رہبر

مجھے کچھ کہنا ہے

اردو افسانوی ادب میں جناب حسن رہبر صاحب کا نام محتاج تعارف نہیں۔ حسن رہبر اردو کے ان افسانہ نگاروں میں ایک ہیں جنہوں نے جدیدیت کی تیز لہروں سے اپنے فکر و فن کو محفوظ رکھتے ہوئے افسانہ نگاری کی زمین پر اپنے فن کی مضبوط عمارت تعمیر کی۔ حسن رہبر کے افسانوں میں افسانے کی روح کہانویت اپنی بھرپور زندگی کے ساتھ موجود رہی ہے۔ غالباً یہ ان کا چوتھا افسانوی مجموعہ ہے اس سے پیشتر ان کے تمام افسانوی مجموعوں کے افسانوں نے نہ صرف حسن رہبر کو ایک کامیاب افسانہ نگار ہونے کی شناخت عطا کی ہے بلکہ حالیہ دنوں کے تمام افسانہ نگاروں کے درمیان ایک مقام خاص سے سرفراز کیا ہے۔ حسن رہبر کے بیشتر افسانے ایک خاص اہمیت کے حامل اس لئے بھی ہیں کہ ان کے افسانے کی کونپلیں زندگی سے پھوٹی ہیں۔ افسانوں سے ہماری وابستگی اگرچہ کافی پرانی ہے لیکن اس حقیقت کو تسلیم کرنا ہوگا کہ صدیوں پہلے افسانوں سے ہماری دلچسپی اس لئے تھی کہ اس وقت ہمارے پاس تفریح طبع اور وقت گذاری کا کوئی وسیلہ میسر نہیں تھا۔ لیکن آج ہمارے پاس تفریح اور وقت گذاری کے ہزاروں وسیلے میسر ہیں اس لئے آج کے افسانوں میں قارئین کے ذہن کو اپنی طرف کھینچنے کی بے پناہ صلاحیت نہ ہو تو ایسے افسانوں کو قارئین کی تلاش ہی رہ جاتی ہے۔ حسن رہبر کے بیشتر افسانوں میں قارئین کے ذہن، دل و دماغ کو اپنی طرف کھینچنے اور پوری دلچسپی کے ساتھ اس کا مطالعہ کرنے کے لئے مجبور کرنے کی تمام تر صلاحیتیں موجود ہیں۔ حسن رہبر کے افسانوں میں زندگی کے کسی نہ کسی الجھے ہوئے ڈور کو سلجھانے کی حسین کوشش نمایاں رہتی ہے۔ حسن رہبر کا ہر افسانہ ہمارے سماج معاشرے اور ملک و قوم سے وابستہ کوئی نہ کوئی مسئلہ نہ صرف اجاگر کرتا ہے بلکہ اس مسئلے کا خوبصورت حل بھی پیش کرتا ہے۔ جس سے اس حقیقت کا اندازہ ہوتا ہے کہ حسن رہبر تصورات کی وادی میں گم ہو کر محض الفاظ کی بازیگری کو بروئے کار لا کر افسانہ نگاری نہیں کرتے بلکہ زندگی کی ننگی حقیقتوں کو افسانوی پیکر عطا کرتے ہیں۔

حسن رہبر کی کہانیوں کا شستہ انداز بیان قارئین کو اپنے ساتھ جوڑے رکھنے کی تمام عمدہ خوبیوں سے معمور ہے۔ ان کی تحریروں میں توازن فکر میں اعتدال اور فن میں حسن و جمال کی حسین آمیزش ہوتی ہے جو اسے پر کشش اور جاذب نظر بنا دیتی ہے۔ حسن رہبر کے افسانوں کے پلاٹ کی ندرت قارئین کی دلچسپی کو برقرار رکھنے میں پوری طرح کامیاب، ان کے افسانوں کے کردار، زندۂ جاوید متحرک ہونے کی وجہ سے قارئین کو یہ کردار آشنا

نظر آتے ہیں۔ واقعات کا تسلسل اس قدر وابستہ و پیوستہ ہوتے ہیں کہ قارئین کو اپنی گرفت میں رکھتے ہیں۔ موضوعات کے انتخاب میں تو حسن رہبر کو کمال حاصل ہے۔ عہد حاضر کی سیاسی بدنظمیاں سماجی نابرابری، طبقاتی کشمکش، جبر وتشدد اور ذہنی پسماندگی، بے راہ روی، نئی نسل کی سوچ، ان کے افسانوں کے موضوعات بنے جس سے اس حقیقت کا اندازہ ہوتا ہے کہ حسن رہبر نے اپنے افسانوں کے ذریعہ صالح اور تعمیری ادب کی پاسداری کا ہر ممکن لحاظ رکھا ہے۔

اس مجموعے میں شامل ان کے تمام افسانے ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ افسانہ ''پس پردہ'' کی ہی بات کیجئے تو افسانے کا مطالعہ قارئین کو حیرت واستعجاب میں ڈال دے گا۔ کوئی خواب وخیال میں بھی یہ نہیں سوچ پائے گا کہ گھریلو ذمہ داریوں کی ادائیگی میں مصروف پڑوسی کا حق ادا کرنے کی ذمہ داری کا احساس رکھنے والی بیگم صاحبہ کسی نوجوان کا ہاتھ تھامے ہوٹل کے محراب نما دروازے سے نکلتی دیکھی جا سکتی ہیں۔ کہانی کا مطالعہ کرتے وقت قاری کا دماغ اس ہولناک منظر کے بارے میں سوچ ہی نہیں سکتا جس منظر پر افسانے کا اختتام ہوا۔ افسانہ ''پس پردہ'' محض افسانہ نہیں بلکہ ہمارے معاشرے میں رونما ہونے والے واقعات کی ایک اچھی اور سچی تصویر ہونے کے ساتھ ساتھ قارئین کے ذہن کو بیدار اور محتاط بھی کرتا ہے۔ جس سے اس افسانے کا اصلاحی پہلو بھی نمایاں ہوتا ہے۔

افسانہ ''پھانس'' کا اختتام بھی تحیر آمیز ہونے کے ساتھ ساتھ سماج اور معاشرے کی ایک تلخ حقیقت کو اجاگر کرتا ہے۔ جس سے حسن رہبر کے اس بیان پر یقین کرنے کو جی چاہتا ہے کہ میں نے کہانیاں نہیں لکھیں بلکہ زندگی کی تلخ حقیقتوں کو افسانوں کا پیکر بخشا ہے۔ افسانہ عرفانہ بھی ملک مین رونما ہونے والے ایک مشہور واقعہ کی تصویر کشی کرتا ہے۔ گھر کی آگ، قاتل، پھولوں کی آگ، سوتے جاگتے لمحے تمام افسانوں میں حسن رہبر نے فن افسانہ نگاری کے فن پر اپنی مضبوط گرفت کے ہونے کا احساس بہت ہی مضبوطی سے کرایا ہے۔ افسانہ بھابھی تو غضب کی کشش اور تجسس سے بھرپور ہے۔ دیور اور بھابھی کے مقدس رشتے کو حسن رہبر نے اس خوبصورتی سے پیش کیا ہے کہ قارئین متحیر رہ جاتے ہیں۔

مجموعی طور پر اس مجموعے میں شامل حسن رہبر کے بیشتر افسانے قارئین کی دلچسپی کا باعث بنیگے۔ ایسا مجھے یقین ہے کیونکہ تمام افسانے ہمارے سماجی معاملات، معاشراتی مسائل اور حالات حاضرہ میں رونما ہونے والے واقعات وحادثات کا آئینہ ہیں۔ میرے خیال میں پیش نظر مجموعہ حسن رہبر کے سابقہ تمام افسانوی مجموعوں سے زیادہ شہرت ومقبولیت کی مثال بنے گا۔

ڈاکٹر محمد نوشاد عالم، صدر شعبۂ اردو، ایم ایس کالج، بھاگلپور

پسِ پردہ

بعض اوقات بھیڑ میں رہتے ہوئے بھی خود کو کتنا اکیلا محسوس کرتا ہوں اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ تنہا سفر کرتے ہوئے لگتا ہے جیسے سارے زمانے کو ساتھ لے کر چل رہا ہوں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے یہ میں خود نہیں جانتا۔ حالانکہ میں نشے کا عادی نہیں۔ مگر نہ جانے کیسے یہ لت ہی کچھ ایسی پڑ گئی ہے کہ چھوٹنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ بارہا اُسے چھوڑنے کا قصد کر چکا ہوں۔ مگر ہر بار میری توبہ ٹوٹتی رہی ہے۔ کبھی دوست احباب کے اصرار پر چند گھونٹ بھرنے پڑے ہیں تو کبھی کسی کا دل رکھنے کے لئے پیالہ ہونٹوں سے لگایا ہے۔ مگر کبھی اپنی حد سے نہیں گزرا۔ ذہنی تھکاوٹ دور کرنے کے لئے تھوڑی سی بیئر لینے میں کوئی مضائقہ تو نہیں؟

جب تنہائی اکھرنے لگے تو یادوں سے کھیلنا اچھا لگتا ہے۔ میں نے کتاب الٹ کر رکھ دی ہے اور بستر سے اٹھ کر کھڑکی کا پردہ تھوڑا اور پھیلا دیا ہے۔ روشنی جالی دار پردے کے نیلے رنگوں میں الجھ کر رہ گئی ہے اور کمرہ دھند میں لپٹ کر سحر زدہ سا ہو گیا ہے۔ کوئی چیز صاف نظر نہیں آتی۔ مگر میں اب بھی کھڑکی کے باہر کا سارا منظر دیکھ سکتا ہوں۔

دور سڑک کے اس پار ایک بھکارن ایک نوجوان کا راستہ روکے اس سے پیسے مانگ رہی ہے اور پاس ہی کھڑا سافٹی کھاتا ایک اوباش لونڈا اسے للچائی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ سامنے سڑک کی دائیں جانب بھاگتی ہوئی امبولنس کار میں جو عورت پسر کر بیٹھی ہے۔ اس کا آخری مہینہ جا رہا ہے۔ اپنی امیدوں کے نئے گلاب کھلانے کہیں جا رہی ہے اور میری بائیں طرف لال بتی والی جو کار گزر رہی ہے اس کی پچھلی سیٹ پر کھدر میں ملبوس ایک منتری جی بیٹھے اونگھ رہے ہیں۔ پر مجھے ان سب سے کیا لینا دینا۔

میری توجہ کا مرکز تو وہ خوبصورت جوڑا ہے، جو چند لمحے پہلے ایک پل کے لئے میری کھڑکی کے پاس رکا تھا۔ ان کے چہروں پر خوف کے سائے لرزاں تھے۔ اچانک لڑکی نے پیچھے مڑ کر دیکھا تھا اور سرگوشیوں میں اپنے بوائے فرینڈ سے کچھ بولی تھی اور پھر دونوں چند قدم آگے جا کر ایک گلی میں مڑ گئے تھے۔

میں انہیں جانتا ہوں ۔ اِن کے قدموں کی آہٹ سے میرے کان نا آشنا نہیں ۔ لڑکی میرے گھر کی دائیں جانب والی گلی کے آخری سرے پر رہتی ہے اور لڑکا اس کے قرب و جوار میں ہی کہیں اپنی بہن کے یہاں رہ کر پڑھ رہا ہے ۔ شاید ہمسائیگی کے اسی رشتے نے دونوں کو ایک دوسرے کے قریب آنے میں مدد دی ہے ۔ پھر ملتے ملاتے ، ہنستے کھیلتے دوستی کی جگہ محبت نے لے لی ہے اور پیار ان کے دلوں کی دھڑکن بن گیا ہے ۔ دونوں کو ایک دوسرے سے ملے بغیر چین نہیں ملتا ۔ ملنے ملانے کے بہانے ڈھونڈتے رہتے ہیں اور پچھلے ایک سال سے ان کی ملاقاتوں کا یہ سلسلہ جاری ہے ۔

جب دونوں نظروں سے اوجھل ہو گئے تو میں نے بیگم کو آواز دی ہے ۔ شاید انہیں میری ضرورت کا احساس ہو گیا ہے ۔ انہوں نے چائے لا کر میرے سامنے تپائی پر رکھ دی ہے ۔ میں صوفے پر بیٹھ کر پیالی ہونٹوں سے لگا لیتا ہوں ۔ بیگم نے بھی اپنی پیالی سنبھال لی ہے ۔ ہم لوگ چپ چاپ چائے پینے لگتے ہیں ۔ چند گھونٹ لے کر میں نے انجانے میں ہی بیگم سے پوچھ لیا ہے ۔

''تمہیں میرے ساتھ کہیں آنا جانا پسند نہیں ۔ لیکن تمہارے بغیر نہ تو مجھے گھومنا اچھا لگتا ہے اور نہ ہوٹل میں بیٹھنا ۔ تنہائی سارا مزہ کرکرا کر دیتی ہے !''

''تو میں کیا کروں ۔ گھر میں تم نے کون سی آیا رکھ چھوڑی ہے کہ گئے رات جب ہم لوٹینگے تو کھانا تیار ملے گا ۔ !''

''تم تو جانتی ہو کہ میں چہل قدمی کا عادی ہوں ۔ بنا ہوٹل جائے چین نہیں ملتا......!''

میں نے چائے کا آخری گھونٹ لے کر سوالیہ نگاہوں سے بیگم کی طرف دیکھا ہے اور بیگم بکھرے سامانوں کو سلیقے سے ان کی جگہوں پر رکھ کر کمرے کی صفائی میں جٹ گئی ہیں ۔

شام ہوتے ہی میں روزانہ چہل قدمی کے لئے گھر سے نکلتا ہوں اور پارک کے ریسٹورانٹ کی کھلی چھت پر جا بیٹھتا ہوں ۔ ہوٹل کا یہ گوشہ مجھے بہت پسند ہے ۔ یہاں سے پارک کی ساری خوبصورتی نگاہوں کے دائرے میں سمٹ آتی ہے ۔

دفتر کے اوقات ختم ہونے کے بعد رنگ برنگے جوڑے ۔ جوان لڑکے اور لڑکیاں روزانہ شام کے خوشگوار لمحات گزارنے یہاں آتے ہیں ۔ کبھی کوئی لڑکی اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ درخت کی جڑوں پر

بیٹھی آئس کریم کھاتی دکھائی دیتی ہے تو کبھی کوئی لڑکا اپنی پسند کی لڑکی کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے خوش گپیوں میں مصروف ہوتا ہے اور میں بیئر کے دو ایک پیگ لیتے ہوئے کئی سگریٹ پھونک ڈالتا ہوں۔ معلوم نہیں میں ہوٹل بیئر لینے کی غرض سے آتا ہوں یا اس جوڑے کو دیکھنے کا خیال مجھے یہاں کھینچ لاتا ہے۔ جسے دیکھ کر دل کی دھڑکنیں بڑھ جاتی ہیں اور جب وہ نہیں ہوتے ہیں تو ان کے متعلق سوچتے رہنا مجھے اچھا لگتا ہے۔

شام ہوتے ہی دونوں اسی ریسٹورانٹ میں ملتے ہیں اور اس کے ایک کیبن میں پہروں بیٹھے باتیں کرتے ہیں۔ مستقبل کے تانے بانے بنتے اور خوابوں کے شیش محل سجاتے ان کی نہ جانے کتنی شامیں یہاں گزری ہیں۔ یہاں کے گوشے گوشے میں ان کی یادوں کی خوشبو بسی ہوئی ہے۔ اس ونگ کا بیرا بھی بڑا ہنس مکھ اور زندہ دل نوجوان ہے۔ ان کے آتے ہی وہ گلاس اور ٹھنڈے پانی کا بوتل ان کے سامنے ٹیبل پر ایک طرف سجا دیتا ہے۔ پھر کندھے سے لٹکے تولئے میں ہاتھ پونچھتے ہوئے تازہ بنے نمکین اور مٹھائیوں کے ڈھیر سارے نام گنا کر ان کی پسند کے آوڈر لیتا ہے۔

کبھی نمکین کے بعد دونوں میٹھا لیتے ہیں اور کبھی ناشتہ کے بعد خواہش ہوئی تو ٹھنڈا چل جاتا ہے۔ جب تک دونوں اندر ہوتے ہیں۔ پردے سے چھن کر ان کی باتیں باہر آتی رہتی ہیں۔ مگر ان کی کوئی بات میرے پلے نہیں پڑتی۔ البتہ کبھی کبھار ایک آدھ جملے کی تہہ تک ضرور پہنچ جاتا ہوں۔ لڑکا ہمیشہ اپنی گرل فرینڈ کے خوبصورت بالوں کی تعریف کرتا ہے۔ لڑکی بھی روز نت نئے ڈھنگ سے بالوں کو سنوار کر آتی ہے۔ دونوں کو ایک دوسرے کی ذات پر بڑا بھروسہ ہے۔ شاید دونوں نے ساتھ مرنے اور جینے کی قسم کھا رکھی ہے۔ لڑکا مالدار گھرانے کا ہے۔ پیسے کی اسے کوئی کمی نہیں۔ ہوٹل کا بل ادا کرتے وقت بیرے کو بھاری ٹپ دینا اس کی عادت سی ہوگئی ہے اور بیرا ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ہمیشہ اپنا سر جھکا لیتا ہے۔

بیرے کی یہ ادا میری نظروں میں ایک دم سے گھوم گئی ہے۔ اور میں مسکرا اٹھا ہوں۔ بیگم کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ پھسل گئی ہے۔

میں نے چونک کر خشمگیں نگاہوں سے بیگم کی طرف دیکھا ہے۔ تبھی بیگم بھاگی ہوئی کچن کی طرف چلی گئی ہیں۔ شاید وہ دودھ کی ہانڈی چولھے سے اتارنا بھول گئی ہیں اور دودھ ابال کھا کر جلنے لگا ہے۔ دودھ کے جلنے کی سوندھی بو میری سانسوں میں کڑواہٹ گھول رہی ہے۔

میں سوچ میں پڑ گیا ہوں۔ بے ربط خیالات ہیں کہ ذہن میں امنڈے چلے آرہے ہیں۔ کبھی اس جوڑے کی تصویریں یادداشت کے پردوں سے ابھرنے لگتی ہیں اور کبھی ان کی مجبوریاں یاد کر کے ہنس پڑتا ہوں۔ کبھی ہم بھی ان ہی کی طرح ایک دوسرے سے ملنے کو بے قرار رہا کرتے تھے اور جب تک پارک کے کسی گوشے میں بیٹھ کر ایک دوسرے کو دیکھ اور سن نہیں لیتے، چین نہیں ملتا تھا۔ ان ہی بے تکے خیالوں میں دن کیسے گزر گیا کچھ پتہ بھی نہیں چلا۔ شام ہوئی تو میں نے بیگم سے پوچھا :

''کیا آج پارک چلنے کا ارادہ نہیں ہے؟''

''نہیں...... آج شاید میں جانہ پاؤں۔ تم ہو آؤ۔!''

''تمہارے یہی نخرے تو مجھے اچھے نہیں لگتے۔!''

''کہا نہ کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور پڑوسن نے بھی بازار جاتے ہوئے اپنے فلیٹ کی چابی میرے پاس رکھ چھوڑی ہے۔ معلوم نہیں اسے کب لوٹنا پڑے۔ ایسے میں اگر اس کا آدمی آ گیا تو کیا کہے گا؟ پڑوسن کے طعنے الگ سننے پڑینگے۔''

''تمہیں نہیں جانا ہے مت جاؤ۔ لیکن اگر وقت نکال پاؤ تو وہیں چلی آنا۔!''

آج چھٹی کا دن تھا۔ سیر سپاٹے کے لئے آنے والوں کی بھیڑ سے پارک کی گہما گہمی بڑھی ہوئی تھی۔ میں ریسٹورانٹ جا کر اپنی میز پر جم گیا ہوں اور بیرے کو پکوڑیوں کے ساتھ دو پیگ بیئر لانے کو کہہ دیا ہے اور بیگم کے انتظار میں ساتھ لایا اخبار دیکھنے لگا ہوں۔

پہلے ہی صفحہ پر جلی سرخیوں میں کسی وزیر کی بیٹی کے اغوا کی خبر چھپی ہے اور علحدگی پسندوں نے اس کی رہائی کے بدلے اپنے ان ساتھیوں کو چھوڑنے کی مانگ کی ہے جو برسوں سے پولس کی قید میں ہیں۔ اب دیکھئے اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔

دوسرے صفحہ کے درمیانی کالموں میں ایک ہنومان کی موت کا واقعہ درج ہے۔ جس کو لے کر پرانے شہر میں بڑے پیمانہ پر فساد پھوٹ پڑا تھا۔ جس میں سینکڑوں جانیں تلف ہوئیں۔ لاکھوں کا نقصان ہوا۔ ایک جانور کے آگے انسان کی یہ حقیقت؟

اس کے بعد کے صفحہ کے آخر میں ایک چھوٹی سی خبر کا عنوان ہے۔ ایک نوجوان نے اپنی عمر کی

دوگنی عورت کے ساتھ شادی رچائی۔

میں نے ان خبروں کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ ایسی خبریں تو روز ہی اخباروں میں آتی ہیں۔ اخبار بھرنے کے لئے یہی تو مسالے اور مواد ہوتے ہیں۔ چھوٹی سی بات ہو یا کوئی معمولی حادثہ...... یہ اخبار والے ایسی سرخیاں لگاتے ہیں کہ معاملہ بڑا سنسنی خیز اور دلچسپ ہو جاتا ہے۔ لوگ پڑھے بنے اخبار نہیں چھوڑتے۔

میں نے اخبار کا پنا الٹ دیا ہے۔ اور میری نگاہ اس خبر پر جم گئی ہے جو واقعی بڑی دلچسپ اور معنی خیز ہے۔ ایک تجربہ کار ٹھیکیدار نے ایک بڑے سرکاری ٹھیکہ کا ٹنڈر بھرا تھا اور ٹھیکیدار کی جوان خوبصورت بیوی جسمانی سفارش لے کر اس افسر کے پاس گئی تھی جسے ٹنڈر کو رد کرنے یا منظور کرنے کا اختیار تھا۔ افسر نے اسے مایوس نہیں کیا اس کے حسن کی خوب داد دی۔ مگر عین وقت پر مالی مشکلات کے باعث ٹھیکہ ہی التوا میں پڑ گیا۔ وہ عورت اپنی فریاد لے کر کوٹ گئی تھی۔ معاملہ اپنی نوعیت کا بالکل انوکھا تھا۔

ابھی میری توجہ اس خبر پر مرکوز ہی تھی کہ بیرا ڈش لے کر آ گیا اور وہ بیئر کا گلاس اور پکوڑی کی طشتری میرے سامنے ٹیبل پر رکھ کر چلا گیا۔ میں اخبار کو موڑ کر ایک طرف رکھ دیتا ہوں۔ بیگم کا اب تک کوئی پتہ نہیں تھا۔ جھنجلاتے ہوئے سوچ رہا ہوں۔ عورتوں کے نخرے بھی بڑے عجب ہوتے ہیں۔ ساتھ نہ دینے کا ارادہ ہو تو ایسے حیلے بہانے گڑھتے ہیں کہ نہ چاہتے ہوئے بھی ان کی باتوں پر یقین کرنا پڑتا ہے۔

میں نے طشتری اپنی جانب کھسکا لی ہے اور ایک پکوڑی منہ میں ڈال کر بیرے کی طرف دیکھا ہے جو کونے کی میز پر بیٹھی عورت کے آگے بل رکھ کر۔ بغل والے ٹیبل کی جانب کھسک گیا ہے جہاں ایک نوجوان نے اسے اشارے سے اپنی طرف بلایا تھا۔ وہ اس گاہک سے نمٹ کر میرے پاس آئے گا اور بل لانے سے پہلے ضرور پوچھے گا۔

"کچھ اور لاؤں صاحب ؟"

میں دھیرے دھیرے بیئر کے گھونٹ لیتا ہوا پکوڑی کھا رہا ہوں۔ نگاہیں کئی بار کیبن کا جائزہ لے چکی ہیں۔ گاہکوں کا آنا جانا ابھی تھما نہیں ہے۔ بیرے بھی دوڑ دھوپ میں مصروف ہیں۔ لیکن کیبن اب تک خالی ہے۔ آخری پکوڑی منہ میں ڈال کر میں نے بیرے کی طرف دیکھا ہے۔

بیرا جوں ہی بل رکھ کر لوٹا ہے۔ میری نگاہ اس جوڑے پر جا کر جم گئی ہے جسے دیکھنے کی خواہش

دل کو بے چین کیئے ہوئے تھی۔ لڑکا عنابی رنگ کا سوٹ پہنے ہوا ہے اور لڑکی جنس کے پینٹ اور ٹی شرٹ میں ملبوس ہے۔ دونوں نے کیبن میں پہنچ کر اطمینان کی سانس لی ہے اور بیرا ابھی آوڈر لینے آ گیا ہے اور میری سوچوں کو ایک نئی راہ مل گئی ہے۔

جب بھی دونوں کیبن میں ہوتے ہیں۔ میری نگاہیں پردے پر جمی رہتی ہے۔ میں اکثر اس خوبصورت لڑکی کی موجودگی کے احساس سے لطف اندوز ہوتا ہوں۔ فضاؤں میں بسی اس کے بدن کی مہک میرے سوئے حس کو جگا دیتی ہے اور میں ماضی میں لوٹ جانا چاہتا ہوں۔ اس وقت نہ جانے کیوں مجھے بیگم کی کمی شدت سے محسوس ہو رہی ہے۔ کاش اگر وہ ہوتیں تو مجھے انتظار کا یہ کرب تو نہیں جھیلنا پڑتا۔ جب ساتھ رہنا ہی زندگی کا مقصد ٹھہرا تو پھر کہاں کے یہ فاصلے۔؟ کیسی یہ دوریاں؟

نہ جانے کیوں آج بیرے نے بھی اس جوڑے کے آوڈر کی تکمیل میں دیر نہیں کی ہے۔ ان کے بیٹھتے ہی اس نے سامنے ٹیبل پر گلاس اور ٹی پارٹ سجا دیا ہے اور کچھ بولے بغیر کیبن کا پردہ درست کرتا ہوا باہر نکل گیا ہے۔

لڑکے نے خود ہی چائے بنائی ہے۔ ایک کپ لڑکی کی طرف بڑھا کر دوسری پیالی اپنی جانب کھسکا لی ہے اور دھیرے دھیرے دونوں چائے کی چسکیاں لینے لگے ہیں۔ ان کے چہرے کی بے اطمینانی بتا رہی ہے کہ زندگی کا کوئی اہم فیصلہ کر کے ہی آج دونوں گھر سے نکلے ہیں۔

چائے ختم ہوتے ہی بیرا بل لے کر آ گیا ہے۔ لڑکے نے ایک موٹی رقم بطور ٹپ اسے دی ہے اور تیزی سے کیبن سے نکلا ہے۔ لڑکی بھی اس کے پیچھے پیچھے ہو لی ہے۔

سڑک پر آ کر انھوں نے ایک ٹیکسی پکڑی ہے اور ایک انجان منزل کی طرف چل پڑے ہیں۔ میں بڑی حسرت سے انہیں جاتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔ معلوم نہیں اب انہیں کبھی دیکھ پاؤں گا بھی یا نہیں۔ دل میں ایک خدشہ سا ابھرا ہے اور بے اختیار میرے قدم گھر کے جانب اٹھ گئے ہیں۔

تبھی میری نگاہ دور سڑک کے اس پار ایک ہوٹل پر جا پڑی ہے۔ جس کے محراب نما دروازے سے بیگم ایک نوجوان کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے باہر نکل رہی تھیں۔

پھانس

وہ بے حد خوبصورت تھی۔ بلا کی حسین، تازہ گلاب کی طرح کھلا ہوا چہرہ، بڑی بڑی نشیلی آنکھیں، لمبا قد جیسے سنگ مرمر کا تراشا ہوا بدن، رنگ روپ میں ایسا نکھار کہ ایک بار دیکھ لو تو نظریں ہٹانے کو جی نہیں چاہے۔ وہ کانوں میں سنہرے ٹاپس اور گلے میں سونے کی زنجیر پہنے ہوئی تھی۔

وہ کس گھر سے نکلی تھی۔ کس گلی سے ہو کر سڑک پر آئی تھی یہ تو میں نے نہیں دیکھا۔ لیکن جب وہ نظروں کے سامنے آئی تو اس کے بدن کی تیز خوشبو نے میرا دھیان اپنی طرف کھینچ لیا اور نگاہیں اس کے چہرے پر جم گئیں۔ اس نے ایک ہی نظر میں میرے دل کی دھڑکنوں کو بے ترتیب کر دیا تھا اور نشہ بن کر میرے ہوش و حواس پر ایسا چھائی تھی کہ مجھے اس کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آ رہا تھا مجھے لگا کہ اگر یہ پری صورت لڑکی میری شریک سفر بن جائے تو زندگی کے لمحات کس قدر خوش گوار گزرینگے۔ میں نے اپنی تقدیر اس کی ہتھیلی پر لکھنے کا من بنا لیا اور سوچ لیا کہ اسے اپنانے کے لئے مجھے جن حالات سے بھی گزرنا پڑے میں ہر دکھ جھیل لونگا۔

اور میں بے اختیار اس کے خیالوں میں ڈوبا۔ پلکوں پر رنگین خواب سجائے اس کے قدموں کی دھول کو اپنی منزل کا نشاں سمجھ کر اس کے پیچھے پیچھے یوں چل پڑا کہ اگر اس نے میرے ارمانوں کی لاج رکھ لی تو میں خوشیوں سے اس کا دامن بھر دونگا۔

اور میرے ذہن سے یہ بات اتر گئی کہ بہن، بہنوئی نے مجھے بلوانے میں جو خرچ اٹھایا ہے وہ بلا وجہ تو نہیں ہوگا۔ اس میں ان کی کوئی غرض یا میرا مفاد ضرور شامل ہوگا۔ ورنہ بلا مقصد کون کس کے پیچھے اتنا خرچ کرتا ہے۔

جس مقصد کے لئے مجھے بلایا گیا تھا اس کی بھنک تو مجھے یہاں پہنچتے ہی مل گئی تھی۔ ان لوگوں نے میرے لئے ایک لڑکی دیکھ رکھی تھی۔ لڑکی پڑھی لکھی اور بہت سلیقہ مند تھی۔ اس کے گھرانے سے میرے

بہنوئی کے تعلقات اچھے اور بہت ہی دوستانہ تھے۔ دونوں ایک ہی شہر کے وی.آئی. پی علاقے میں کچھ ہی فاصلے پر رہتے تھے۔

لڑکی میری بہن کو بہت پسند تھی اور اس کے گھر والے چاہتے تھے کہ ایسی خوب صورت اور خوش مزاج لڑکی اگر اپنوں کے درمیان بیاہ کر گئی تو اچھا رہے گا۔ لیکن وہ میری مرضی کے بغیر ہاں کہنا نہیں چاہتے تھے۔ اسی لئے مجھے بلایا گیا تھا۔

مجھے تو یہ بھی یاد نہیں رہا کہ میں جس لڑکی کو دیکھنے آیا ہوں اگر وہ میری پسند پر پوری اتری تو یقیناً مجھ پر دولت کے دروازے کھل جائینگے۔ جہیز میں لاکھوں کی جائداد کے ساتھ سرکاری ملازمت بھی ملے گی۔

مگر وہ تو ہر فکر سے بے پرواہ، ہر بات سے بے خبر، میری توجہ کا مرکز بنی، نئے فتنے جگا رہی تھی۔ اسے کیا معلوم کہ میں نے اپنے آرزوؤں کے کنول کو اس کی مرضی پر کھلنے کے لئے چھوڑ دیا ہے۔ اور یہ یقین کر بیٹھا ہوں کہ اگر اس کی نظروں کا وارن بھی مجھے مل گیا تو میری زندگی سنور جائے گی۔

ساتھ چلتے ہوئے میں نے کئی بار چاہا کہ اس سے پوچھوں۔ لیکن یہ سوچ کر ہمت نہیں ہوئی کہ راہ چلتی لڑکیوں کو چھیڑنا اچھا نہیں۔ معلوم نہیں کون کیا مطلب نکالے۔ حالانکہ وقت نے میرے اندر حالات سے نمٹنے کی ہمت جتا دی تھی لیکن دل کے کسی کونے میں ایک ڈر بھی سمایا ہوا تھا کہ مجھ سے ذرا بھی چوک ہوئی یا میں کوئی بھول کر بیٹھا اور وہ نظروں سے اوجھل ہوگئی یا راستے میں کہیں کھوگئی تو اس کی کسک مجھے ساری عمر تڑپاتی رہے گی۔

بھیڑ بھرے چوراہے پر ایک جگہ بیڑی پان کی دکان دیکھ کر مجھے سگریٹ کی طلب محسوس ہوئی تو میں نے دکاندار سے ایک سگریٹ لے کر سلگایا اور چند کش لے کر پلٹا تو وہ نظروں سے غائب تھی۔ دور تک اس کا کوئی پتا نہیں تھا۔ میرے من میں اداسی سی چھا گئی اور محرومی کا احساس کرچیوں کی طرح سارے وجود میں چبھنے لگا۔ ہر شئے پھیکی پھیکی اور بجھی بجھی سی نظر آنے لگی۔

یوں ہی فٹ پاتھ پر ٹہلتے ہوئے میں نے اس کا بہت انتظار کیا۔ آس پاس کی گلیوں کے کئی چکر لگائے۔ سگریٹ پھونکتے اور مونگ پھلیاں پھانکتے ہوئے کئی گھنٹے گزر گئے۔ مگر میری حسرتوں کا کشکول اس کے دیدار کی خیرات سے خالی رہا۔

دوسرے دن بھی میری بے چین نگاہیں اس کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹکتی رہیں۔ میں نے ہر وہ جگہ دیکھ لی جہاں اس کے ملنے کے امکانات تھے۔ مگر وہ ملی کہیں نہیں۔ نظریں تو تھک کر ہار گئیں۔ مگر چاہ کر بھی میں اسے بھول نہیں سکا۔

نہ جانے اس کی ذات میں کیسی کشش تھی کہ اس کے انتظار میں بھی ایک عجیب خوشی اور مسرت آمیز سکون کا احساس ہوتا تھا۔ یہ میری چاہت کا خمار تھا۔ یا اس کو دیکھنے کی تمنا۔ جس کی خلش مجھے اس گلی کے بار بار چکر لگانے پر مجبور کر رہی تھی۔ جس کے نکڑ پر میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا اور اس کے تصور کو ذہن میں بسا کر کئی خواب بنے تھے۔

مگر اس دن۔ شام ہونے سے ذرا پہلے وہ مجھے اتفاقاً مل گئی۔ اس کے ہاتھ میں شاپنگ بیگ تھا۔ وہ بازار سے خریداری کر کے لوٹ رہی تھی۔ جوں ہی رکشہ سے اتر کر اس نے گلی میں قدم رکھا میں آگے بڑھ کر اس کے سامنے آ گیا۔ ایک پل کے لئے اس نے میری طرف دیکھا اور پھر سر کو خفیف سی جنبش دے کر آگے بڑھ گئی۔ میں خود کو روک نہیں سکا اور پوچھ لیا۔

''اگر برا نہ مانو تو مجھے بتاؤ کہ کیا تم یہیں کہیں رہتی ہو؟''

''ہاں۔ مگر تمہیں اس سے مطلب۔؟''

''بالکل تمہاری جیسی ایک لڑکی میری بہن کی دوست ہے جسے میں ڈھونڈ رہا ہوں!''

''کچھ اجنبی سے لگتے ہو؟''

''ہاں پہلی بار آیا ہوں۔ لیکن تمہیں دیکھ کر ایسا گمان گزرتا ہے کہ کہیں تم وہی لڑکی تو نہیں جس کے لئے میں یہاں آیا ہوں!''

''کسی خوش فہمی میں مت پڑو۔!''

''کیا تمہاری نظر میں کوئی ایسی لڑکی ہے جو شکل و صورت میں تم سے ملتی جلتی ہو؟''

''مجھے نہیں معلوم! لیکن سنا ہے کہ میری بہن کی ایک سہیلی کا چہرہ بھی کچھ میرے جیسا ہے اور اس کے رشتے کی بات بھی چل رہی ہے۔!''

''کیا ہم لوگ چند منٹ کے لئے کہیں بیٹھ کر اس گتھی کو سلجھا نہیں سکتے؟''

اس نے ایک بار پھر بڑے غور سے میری طرف دیکھا اور چہرے پر آئی بالوں کی ایک لٹ کو ہٹاتے ہوئے مسکرا کر میرے سامنے ایک سوال رکھ دیا۔

"اگر تمہارے پاس ہزار پانچ سو روپے ہوں تو دے دو۔ گھر میں دے لوں تو ساتھ چلونگی۔"

اس کی آواز میں ایسا جادو اور چہرے پر ایسی انکساری تھی کہ بنا سوچے سمجھے میری جیب میں جتنے پیسے تھے میں نے نکال کر اسی کی ہتھیلی پر رکھ دیئے۔!

اس نے بدبدا کر میرا شکریہ ادا کیا اور نوٹوں کو اپنے پرس میں رکھ کر شہر کے سب سے مہنگے ہوٹل میں چلنے کی فرمائش کر دی۔

"تم سواری کا انتظام کرو۔ میں کپڑے بدل کر آتی ہوں!"

وہ گلی میں چند قدم آگے جا کر ایک خوبصورت سے بنگلے کے سامنے رکی۔ ایک پل کے لئے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور گیٹ کا چھوٹا دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔

میرے پاس تو اب اسے چائے پلانے تک کے پیسے نہیں تھے۔ سواری کا انتظام کہاں سے کرتا۔ من ایک پھانس سی اٹک گئی اور سارا وجود سناٹے میں ڈوب گیا۔

شکست خوردہ کھلاڑی کی طرح گھر لوٹتے ہوئے دوستوں کے وہ جملے میرا پیچھا کرنے لگے جو انہوں نے مجھے ٹرین میں چھوڑتے ہوئے کہے تھے۔

دیکھنا یار تم ہوٹلوں کے گرد منڈلانے والی کسی لڑکی کے چکر میں مت پڑنا۔ کلبوں اور تفریح گاہوں کے آس پاس چہل قدمی کرنے والی لڑکیاں بڑی تیز وطرار ہوتی ہیں۔ چند میٹھے بول کے عوض لڑکوں کی جیبوں کے سارے پیسے اڑا لیتی ہیں۔ لیکن میرا ان باتوں سے کیا لینا دینا۔ یہ تو محض اتفاق تھا یا کوئی حادثہ۔ جو میں اس کے جھانسے میں آگیا۔ ورنہ ایسا کچھ ہوتا کہاں ہے؟

میں نے ان خیالوں کو ذہن سے جھٹک کر من کو صاف کر لیا۔

کئی دن یوں ہی بیت گئے۔ لیکن ایک شام اچانک بہن نے اس لڑکی سے ملنے کا پروگرام بنالیا۔ جس کے لئے میں یہاں بلایا گیا تھا۔ اس مقصد کے لئے اس نے پہلے ہی شہر کے ہوٹل کا ایک کمرہ بک کر رکھا تھا۔ جب ہم وہاں پہنچے تو ویٹر نے میز پر ٹھنڈے پانی کی بوتلیں سجا دیں اور بہن کے اشارے پر

اورنج جوس کے دو بوتل رکھ دیئے۔

لڑکی ابھی آئی نہیں تھی ۔ وقت گزارنے کے لئے ہم لوگ باتیں کرنے لگے ۔ بہن لڑکی کے بارے میں ایک ایک بات تفصیل سے بتاتی رہی ۔لڑکی کا رنگ کیسا ہے ۔لڑکی مزاج کی کیسی ہے ۔اسے کون سالباس پسند ہے۔ بریانی تو ایسالذیز بناتی ہے کہ کھاؤ تو پیٹ بھر جائے مگر من نہیں بھرے۔

بیٹھے بیٹھے چسکیوں میں ہم نے اورنج جوس کی دونوں بوتلیں خالی کر ڈالیں ۔لیکن لڑکی کا کوئی پتہ نہیں تھا۔ مجھے اکتاہٹ سی محسوس ہوئی تو میں نے پوچھا۔

''لگتا ہے لڑکی کے من میں کوئی اور ہے۔ ورنہ اب تک آ چکی ہوتی !''

''تم کیا جانو۔ وہ تو ایسی شرمیلی ہے کہ ایک اجنبی لڑکے سے ملنے میں بھی جھجھک محسوس کر رہی ہے!''

مجھے تو بہن کی مرضی کا خیال رکھنا تھا اور سگریٹ کی خواہش الگ ستا رہی تھی ۔ میں نے اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔

''ہاں لڑکی کے اس انتظار کا بھی الگ مزہ ہے۔ تم ٹھہرو۔ میں ذرا باہر سے ہو کر آتا ہوں ۔!''

اٹھتے ہوئے میں نے ابھی بات بھی پوری نہیں کی تھی مجھے باہر کسی کے تیز قدموں کی آہٹ نزدیک آتی سنائی دی۔ میں اپنی جگہ بیٹھ گیا۔

تبھی چہرے پر شرم وحیا کی شوخیاں بکھیرے ایک لڑکی کمرے کا پردہ سرکا کر اندر آئی۔ اس کی پلکیں جھکی ہوئی تھیں۔

لیکن میں نے پہچان لیا اور بے اختیار میرے منھ سے ایک چیخ سی نکل گئی۔

''ارے تم۔؟''

''ہاں میں۔ لیکن اس میں تمہیں گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ۔ میں اس لڑکی کو تم سے ملانے لائی ہوں جس کے لئے تمہیں یہاں بلایا گیا ہے۔''

اور میں حیرت بھری نظروں سے کبھی اس کو اور کبھی اس کے پیچھے کھڑی لڑکی کو دیکھتا رہ گیا۔

گھر کی آگ

میں اہنسا کا پجاری تھا۔

ہمارے آبا و اجداد عدم تشدد پر یقین رکھتے تھے۔ ہمیشہ جنگ و جدال کے خلاف جدوجہد کرتے رہے اور دنیا کی رہنمائی کا شرف انہیں حاصل ہوا۔

ایک روز میری قسمت بھی مجھ پر اتنا مہربان ہوئی کہ مجھے ایک پیڑ کی چھاؤں میں اپنی تپسیا کا گیان مل گیا اور سمندر پر جھکے بادلوں میں انکی آتما کا درشن بھی پراپت ہو گیا اور میں نے راج گدی تیاگ دی اور انسانیت کی خدمت کو اپنا نصب العین بنا لیا۔ وراثت میں حکمرانی کا جو تجربہ ملا تھا۔ وہ میرے بہت کام آیا۔ میں نے رنگ بھید کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ ذات پات اور اونچ نیچ کے فرق کو مٹانے کا تہیہ کر لیا۔

اور اس روز جب موسم بڑا سہانا...... رات لمبی اور فضا خنک آلود تھی۔ میں امن کا پیغام لئے شہروں، قصبوں اور ریتیلی بستیوں کے گلی کوچوں میں شانتی کی فضا قائم کرنے گھر سے نکل پڑا۔

مجھے ملک کے کس علاقے میں کہاں جانا ہے۔ کس شہر میں کس سے ملنا ہے۔ کس گاؤں میں کس کی فریاد سننی ہے اور کس مقام پر کس کو اس کی ناجائز حرکتوں سے باز رکھنے کے لئے اپنے اثر و رسوخ کا استعمال کرنا ہے۔ میں نے اپنے دورے کی پوری تفصیل پہلے سے ہی اپنے فائل میں محفوظ کر لی تھی۔

میں چھوٹے بڑے شہروں، گاؤں کے چوک چوراہوں پر مختلف خیالات کے لوگوں سے ملتا الگ الگ فرقے کے رہنماؤں سے بات چیت کرتا۔ ان کے مسائل سنتا اور ہر طرح کے معاملے نمٹاتا آگے بڑھتا رہا۔ میرے خیر سگالی کے دورے اور امن و شانتی کے اس پیغام کا سماج پر بڑا اچھا اثر پڑا اور لوگ خود ہی اپنے اپنے علاقے میں امن کمیٹیاں قائم کر کے میرے اس کام کو آگے بڑھانے میں میری مدد کرنے لگے اور حالات میں ایک خوشگوار تبدیلی نظر آنے لگی۔

دھیرے دھیرے میں لوگوں کے رہن سہن۔طور طریقے۔مزاج بات اور تازہ صورت حال کا جائزہ لیتا جب ملک کی راجدھانی میں داخل ہوا تو لوگوں نے مجھ پر اپنے دروازے کھول دئے۔ ہر جگہ میری آؤ بھگت ہوئی۔ مجھے بڑا حوصلہ ملا۔ حالانکہ کام بہت کٹھن اور دشوار تھا۔لیکن میں نے ہمت نہیں ہاری۔دل میں انسانی خدمت کا جذبہ اور کام کرنے کی سچی لگن ہو تو منزل کی راہیں خود ہی قدموں میں بچھ جاتی ہیں۔

ملک میں امن وشانتی کی فضا قائم کرنے اور بھائی چارے کا ماحول بنانے میں مجھے دو چار مہینے نہیں...... برسہا برس لگ گئے۔لیکن نہ تو میری راہ میں کوئی اڑچن آئی اور نہ مجھے کسی تھکاوٹ کا احساس ہوا۔

میں تو جہاں جہاں گیا ہر مقام پر میرا والہانہ استقبال ہوا۔ ہر جگہ میری مستقل مزاجی اور ثابت قدمی کی قدر ہوئی۔لوگوں نے میری مخلصانہ کوششوں اور خیر سگالی کے جذبات کو خوب سراہا اور قدم سے قدم ملا کر ایک ساتھ چلنے پر بھی آمادہ ہو گئے۔

میرے مضبوط ارادے۔ پختہ عزائم اور خدمت خلق کے جذبے کو دیکھ کر لوگوں نے ایک دن دنیا میں امن قائم کرنے کی ذمہ داریاں بھی میرے ہی کمزور کاندھوں پر ڈال دیں۔

کام کوئی آسان نہیں تھا۔ بڑے ہی صبر آزما لمحے اور پل صراط سے گزرنے جیسا نازک اور تلخ تھا اور اکیلے میرے بس کی یہ بات بھی نہیں تھی۔لیکن جب لوگوں نے مجھ پر بھروسہ کیا اور میرے اوپر ذمہ داریاں ڈال دیں تو مجھے بھی ان کے جذبات اور احساسات کا خیال کرنا پڑا اور اس کام کو ایک فرض کی طرح پورا کرنے کی من میں ٹھان لی اور ایک نئے جوش، جذبے اور مستعدی کے ساتھ اپنے کام کے پرچار میں جٹ گیا۔

ہمیں اس کام کا تجربہ تو پہلے ہی اپنے ملک کے بدلتے حالات اور لوگوں کے نیک رجحان سے ہو چکا تھا۔

سب سے پہلے میں نے اپنے قریبی ساتھیوں اور دوستوں کی ایک ٹولی بنائی۔اور کئی ترقیاتی منصوبے ترتیب دئے اور الگ الگ لوگوں کو اس کی ذمہ داریاں سونپ کر ہم اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔

ابتدائی سفر کے دوران ہمیں جس ملک میں جانے کا اتفاق ہوا۔وہاں کے حالات عجیب و

غریب تھے۔ہم نے جنگ سے تباہ حال لوگوں کی خوشحالی کے کئی کام کیئے۔ نئے مکانات تعمیر کرائے۔ سڑکیں مرمت کرائیں۔جنگی قیدیوں کی رہائی اور پناہ گزینوں کی واپسی کا مسئلہ حل کیا۔تب لوگوں نے اطمینان کی سانس لی۔

ہم وہاں سے آگے بڑھے تو اس ملک میں ہمارا قیام رہا۔ جہاں ہم نے فساد زدہ لوگوں کی اجڑی بستیوں کو پھر سے بسایا۔لوگوں میں اعتماد کی فضا بحال کی۔اور جلد ہی لوگ تمام گلے شکوے اور شکایتیں بھول کر ایک ساتھ میل جول سے رہنے لگے۔تو ہمیں بڑی راحت کا احساس ہوا۔

اس کے بعد ہم اس ملک جا پہونچے۔ جہاں زلزلے اور بھاری سیلاب سے متاثر لوگوں کی فلاح و بہبود کے لئے پہلے سے ہی کئی ادارے کام کر رہے تھے۔ہم نے ان کی کارکردگی کا جائزہ لیا۔جہاں جو کمیاں رہ گئی تھیں انہیں جلد سے جلد پورا کرنے کی ہدایت دے کر آگے بڑھ گئے۔

دھیرے دھیرے وقت نے کروٹ بدلی۔ترقی کا دور آیا۔رابطے کے نئے نئے وسائل سامنے آئے تو ہم نے بھی الیکٹرونک میڈیا کا سہارا لیا۔اپنے موقف کی وضاحت کی اور لوگوں کو بتایا کہ شانتی کے بغیر نہ تو کوئی ملک ترقی کر سکتا ہے اور نہ اس کی سالمیت برقرار رہ سکتی ہے۔تب لوگوں کے اندر کی انسانیت جاگی اور بڑھ چڑھ کر بھی اس کار خیر میں ہمارا ہاتھ بٹانے لگے اور ماحول خوشگوار ہونے لگا۔

مگر ابھی بعض ممالک کے کئی تصفیہ طلب ہمارے زیر غور تھے۔جن سے نمٹنا تھا۔کہیں کالے گورے کا جھگڑا۔کہیں شیعہ سنی فساد اور کہیں ذات پات کی لڑائی۔

ان میں ایک معاملہ ایسا بھی تھا۔جو نہ جانے کب سے ہمارے لئے دردسر بنا ہوا تھا۔کسی بات کو لے کر دو پڑوسی ممالک کے درمیان ہونے والی بار بار کی سرحدی جھڑپوں نے دونوں جانب نزدیکی بستیوں میں رہنے والوں کی زندگی اجیرن بنا رکھی تھی۔کب کیا ہو جائے...... ہر پل لوگوں کو اپنے جان و مال کی فکر پڑی رہتی تھی۔

اگر باہمی رضامندی کے ساتھ اس مسئلے کا کوئی منصفانہ حل نکل آیا تو یہ ہمارے لئے بڑی خوش نصیبی کی بات ہوگی کہ ہم نے جس کام کو کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا۔ہم اپنے مقصد کو حاصل کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔

ہم دنیاوی حالات پر نظر رکھے ہوئے تھے اور اس کدوکاوش میں تھے کہ بروقت لوگوں کو راحت اور انصاف مل سکے۔ تاکہ لوگ سکھ چین کی زندگی جی سکیں۔

ہمارے یہاں جو فلاحی ادارے اور رضا کار تنظیمیں کام کر رہی تھیں ہم نے پہلے ہی ان میں اتنی وسعت دے دی تھی اور ان کے دائرے اختیار کو اتنا بڑھا دیا تھا کہ ہم دفتروں میں بیٹھ کر ہی دنیا کے حرکات اور سکنات پر نظر رکھنے لگے تھے۔

دنیا کے کس گوشے کس خطے میں کیا ہو رہا ہے۔ ہمیں پل پل اس کی جانکاری ملتی رہتی تھی۔ ہم نے تازہ صورت حال سے باخبر رہنے اور نئی الجھنوں سے نمٹنے کے اپائے کر رکھے تھے۔ ہر طرف اپنے نمائندوں کا ایک جال سا بچھا رکھا تھا۔ جو ہر گھڑی، ہر لمحہ بدلتے موسم کی پہچان اور ہواؤں کے رخ کی جانکاری ہمیں دیتے رہتے تھے۔ ذات پات کا مسئلہ ہو۔ بھوکے ننگے عوام کی خود کفالت یا ان کی حق تلفی کا معاملہ ہو جب تک ہم ان کے مسائل سلجھا نہیں دیتے ہمارا ضمیر ہمیں بے چین کئے رہتا۔

ہم نے شہر سے ذرا ہٹ کر سمندر کے قریب نہایت پر فضا مقام پر ایک نہایت شاندار کئی منزلہ عمارت تعمیر کرائی تھی جس کی ہر منزل میں سو سے زیادہ کمرے تھے۔ نہایت صاف ستھرے ہوادار اور ہر طرح کے ذیب و آرائش سے مزین۔

عمارت کے نچلے حصے میں ہمارے دفاتر تھے۔ اور اس کے وسیع ہال میں امن کے لئے عالمی کانفرنسیں منعقد ہوا کرتی تھیں اور اس کے اوپر کے خوبصورت کشادہ ایر کنڈیشن کمروں میں معزز مہمان اور سربراہان مملکت کو ٹھہرایا جاتا تھا۔ اس کے باقی منزلوں کے کچھ کمروں میں غیر ملکی نمائندے رہتے تھے اور کچھ میں ان کے دفاتر تھے۔ اور کچھ افسران جو اپنے اپنے ملک کے مفادات پر نظر رکھنے کے لئے یہاں مامور کئے گئے تھے۔

ہم نے کمزور اور پس ماندہ طبقوں کی بھلائی کے لئے ایک فنڈ بھی قائم کر رکھا تھا۔ جس سے قحط زدہ اور سیلاب سے متاثر لوگوں کی امداد، فریادرسوں کی دادرسی، ظلم و تشدد کے شکار مہاجرین اور ہلاک شدگان کی بیواؤں اور بچوں کی خود کفالت کا بندوبست بھی کیا جاتا تھا۔

میری قیادت کی بڑی پذیرائی ہوئی۔ ہر طبقے اور ہر فرقے کا پیار اور تعاون ملا۔ شانتی کی راہ

میں بہت سی رکاوٹیں آئیں۔ اختلافات کے کئی خلیج پاٹے ۔ دشمنوں کو دوست بنایا۔ دھیرے دھیرے سارے مسئلے ایک ایک کر کے سلجھتے رہے اور حالات میں بہتری آنے لگی۔

ہماری اس قدر و منزلت کے سامنے کئی سربراہان مملکت اپنا قد چھوٹا محسوس کرنے لگے اور اپنی برتری کا بھرم رکھنے کے لئے میرے خلاف طرح طرح کی سازشیں کرنے لگے ۔ حالانکہ ان مٹھی بھر جھوٹی افواہیں پھیلانے والوں اور ایک دوسرے کو آپس میں لڑا کر اپنا الو سیدھا کرنے والوں کو دنیا جانتی تھی اور ان کے کارناموں سے واقف تھی ۔ لیکن ہماری کردار کشی کے لئے انہوں نے اپنے خزانے کا منہ کھول دیا تو ہمارے کئی اپنے بھی ان کے جھانسے میں آ گئے۔

لیکن ہم نے اپنی مخالفت کی کوئی پرواہ نہیں کی ۔ بلا خوف و خطر نہایت خوش دلی اور جرائت مندی کے ساتھ اپنے کاموں کا سلسلہ جاری رکھا۔ پرانی گتھیاں سلجھ رہی تھیں ۔ لیکن نئے مسائل بھی سامنے آ رہے تھے ۔ جس نے مجھے فکر مند بنا دیا تھا۔ اور ماتھے پر سوچ کی سلوٹوں نے اپنے رنگ جما لئے تھے۔ طویل جدوجہد ...... اور مغز ماری نے ہمیں اندر سے توڑ دیا۔ روز روز کی دوڑ دھوپ اور دماغ سوزی ہمارے لئے پریشانیوں کا باعث بن گئی۔

اس روز گرمی بہت تھی ۔ صبح سے بجلی بھی غائب تھی ۔ جنریٹروں کو بھی جیسے آج ہی خراب ہونے تھے ۔ دیر تک فائلوں میں سر کھپاتے دماغ بوجھل ہونے لگا۔ دماغ تو رات سے ہی گرم تھا۔ جب بیوی نے کھانے سے فارغ ہوتے ہی مجھے ایک نئی الجھن میں ڈال دیا تھا۔

آپ کو گھر داری کا کوئی خیال نہیں ۔ مگر میری تو جان پر بنی ہے ۔ کئی دنوں سے بڑے لڑکے نے ایک ضد پکڑ رکھی ہے ۔ وہ پھلوں کے باغات اور سبزہ زار درختوں کے قدرتی مناظر بیچ کر اپنے رہنے کے لئے عالیشان عمارت بنانا چاہتا ہے۔

چھوٹا الگ کل رات سے منہ پھلائے بیٹھا ہے کہ وہ تیل کے کنویں اور چائے کے باغات کو گروی رکھ کر اپنی سسرال سے ملی زمین پر بسنے کا خواب دیکھ رہا ہے۔

بھائیوں میں بھی وراثت کے بٹوارے کو لے کر گھر میں ایک عجیب صورت حال بنی ہوئی ہے۔ ان کے گھر کی مالی حالت اچھی نہیں ۔ ماحول میں اجنبی پن کا احساس ہوتا ہے ۔ ہر طرف تناؤ اور بے گانگی

کے پہرے ہیں۔ ماسٹروں کو کئی ماہ سے تنخواہیں نہیں ملیں۔ بچوں کا دودھ بازار سے غائب ہے۔ ملازم ہڑتال پر ہیں۔نوکرانیاں الگ جوٹھے برتن مانجھنے اور اترن کپڑے دھونے سے انکار کر چکی ہیں۔

چھوٹی چھوٹی ان بے کار اور لا حاصل باتوں کی طرف میرا دھیان پہلے کبھی نہیں گیا تھا۔ میں جانتا تھا۔ یہ سب وقتی الجھنیں ہیں۔آئے دن ایسا ہوتا ہی رہتا ہے۔ دھیرے دھیرے سب ٹھیک ہو جائے گا۔

مگر بیوی کے شکایت بھرے لہجے نے میرا ضمیر جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور سوچ کی نئی راہیں کھول دیں۔ سہ پہر کے بعد سب لوگ آفس چھوڑ کر چلے گئے۔لیکن میں اپنی کرسی پر جما رہا۔ مجھے ایک فائل تیار کرنی تھی۔ مختلف تجویزوں پر غور وخوص کے بعد ایک مسودہ تیار کرنے میں کافی وقت لگ گیا۔ ایک الجھن دور ہوئی تو ایک عجیب سی طمانیت کا احساس ہوا۔ میں نے بوجھل پلکیں بند کر کے خود کو کرسی کی پشت سے ٹکا دیا اور ستانے کی غرض سے ٹیبل پر اپنے پاؤں پھیلا دئے۔ سخت تھکا دینے والا دن گزارنے کے بعد کمرے کی سکون آمیز فضاؤں نے آنکھوں میں نیند بھر دی اور میں سو گیا۔

ابھی ٹھیک سے نیند بھی نہیں آئی تھی کہ لگا جیسے شمشان گھاٹ کے کتوں نے اچانک مجھے گھیر لیا ہو اور دم بھر میں وہ میری بوٹیاں نوچ ڈالینگے۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ دیکھا سارا کمرہ دھوئیں سے اٹا ہوا تھا۔ ٹیبل پر پڑے کاغذات اور شلف میں سجی فائیل جل رہی تھیں۔آگ کے شعلے چھت کو چھو رہے تھے۔ میری آنکھوں میں کانٹے سے چبھنے لگے۔ اور گھٹن سے جی گھبرانے لگا۔ بڑی مشکل سے میں نے اپنے وجود کو گھسیٹ کر باہر نکالا۔

لان میں پہونچ کر چاروں طرف دیکھا۔ ہر طرف پراسرار خاموشی چھائی تھی۔ دور تک کوئی نہیں تھا۔ سڑکوں پر سناٹا اور گلیاں سونی پڑی تھیں۔ باہری گیٹ پر دیوار سے ٹیک لگائے ٹول پر بیٹھا چپراسی اونگھ رہا تھا۔

بھابی

کبھی کبھی کچھ ایسے حالات سامنے آجاتے ہیں کہ آدمی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کرے تو کیا کرے؟ وقت نے مجھے بھی اسی راہ پر لا کھڑا کیا ہے۔ جہاں میری سوچ کی یہ کڑی میری راہ کا کانٹا بنی ہوئی ہے۔

سوچتا ہوں ہمارا رشتہ اتنا غیر یقینی تو نہیں تھا کہ ذرا سی دھوپ میں اس کا رنگ اتر جاتا۔ ہم تو ایک دوسرے کو دل و جان سے چاہتے تھے۔ اگر انہیں دکھ ہی دینا تھا تو مجھے اپنے قریب آنے کی دعوت کیوں دی؟ من میں اپنے پیار کی تڑپ جگا کر مجھے خوابوں میں بھٹکنے کے لئے کیوں چھوڑ دیا۔؟

محبت میں پہل تو بھابی نے ہی کی تھی۔ میرے لئے ان کے دل میں جو جذبہ، کشش اور چاہت تھی میں نے ہمیشہ اسے قدر کی نگاہوں سے دیکھا اور ان کے خوابوں میں اپنے پیار کا رنگ بھرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ بھابی میری شخصیت سے بہت متاثر تھیں۔ میرا کردار، میری گفتگو اور گفتگو کا انداز انہیں بے حد پسند تھا۔ ان کے برتاؤ میں میرے لئے جو والہانہ پن تھا اس نے مجھے اپنا گرویدہ بنالیا تھا۔ شاید اپنی جانب میرا جھکاؤ دیکھ کر ہی وہ کئی بار مجھے آزما چکی تھیں اور ہر بار میں ان کے مزاج کی کسوٹی پر کھرا اترتا رہا۔

میرے من میں ان کے لئے بے پناہ چاہت تھی۔ مگر میں نے کبھی ان کے سامنے اس کا اظہار نہیں کیا۔ اور نہ کبھی مجھ سے ایسی کوئی بھول ہوئی جس سے ان کے ارادے کو تقویت ملتی یا حوصلے کو بڑھاوا ملتا۔ میں اپنے اندر اٹھے اس طوفان کو دبائے بیٹھا تھا۔ جس کی ہر لہر ان کی محبت کے گیت گنگنا رہی تھی۔

بھابی کا رشتہ کتنا پیارا اور اپنائیت سے کیسا بھرپور ہوتا ہے کہ سنتے ہی اس کی مٹھاس کانوں میں رس گھول دیتی ہے۔ آنکھوں میں جیسے قوس قزح کے رنگ بکھر جاتے ہیں۔

میں نے بھابی جیسی خوش مزاج اور نرم دل عورت پہلے کبھی نہیں دیکھی۔ ایک عجیب طبیعت پائی

ہے انہوں نے ،ایک ان بجھی پہیلی کی طرح ہمیشہ میرے ذہن پر سوار رہتی ہیں۔ جتنا اس گتھی کو سلجھاؤ اتنی ہی الجھنیں بڑھتی جائیں۔ کبھی اس کا کوئی سرا میرے ہاتھ نہیں آیا۔

میں نے بارہا سوچا ہے کہ بھابی مجھ پر اتنی مہربان کیوں ہیں؟ انہوں نے مجھے اتنی چھوٹ کیوں دے رکھی ہے۔ کہ میں ان ہی کا ہو کر رہ گیا ہوں۔ نہ جانے انہیں میری کون سی ادا بھا گئی ہے کہ وہ میرے ہی خواب دیکھنے لگی ہیں۔ مجھے بھابی کی باتوں پر یقین ہے کہ ایک نہ ایک دن ہم ایک دوسرے کے خوابوں کی تعبیر بنیں گے۔

میں نے کئی بار بھابی کو ٹٹولا ہے۔ انہیں پرکھنے کی کوشش کی ہے اور پوچھا ہے کہ بتاؤ اگر ایک مرد کو کسی عورت سے محبت ہو جائے یا کسی لڑکی کا دل کسی نوجوان پر آجائے ...... تو کیا ان کی کیفیت بھی مجھ جیسی ہوتی ہے۔ جن حالات سے میں گزر رہا ہوں!

بھابی مسکرا کر رہ جاتیں اور میں ان کی شوخ آنکھوں میں جھانک کر اپنے دل کی بات کہہ دیتا کہ ''بھابی میرا تو دل چاہتا ہے کہ ہر پل تم میری نظروں کے سامنے بیٹھی میری زندگی کے پہلوؤں کو کریدتی کھنگالتی رہو اور میں تم پر اپنے پیار کی سوغات لٹاتا رہوں۔''

''بس کرو...... بہت ہو چکا۔ اب یہ بتاؤ کہ تم کہانی کے کسی کردار کا ذکر کر رہے ہو۔ یا میری سوچ کو زبان دے رہے ہو؟''

''آپ جب نہیں ملی تھیں۔ تب تو ایسا مجھے کچھ محسوس نہیں ہوتا تھا۔''

''یہ شخصیت کا اثر ہے یا تمہاری آنکھوں کا جادو...... کہ تمہیں دیکھتے ہی اداس چہرے کھل اٹھتے ہیں۔ میرے پژمردہ ہونٹوں پر مسکراہٹ لوٹ آتی ہے۔ تم سے باتیں کر کے من کا بوجھ ہلکا کر لیتی ہوں''۔

بھابی مجھے اپنے خیالوں کی رنگین وادیوں میں کہیں گم کر دیتیں۔

بھابی میری اپنی تو نہیں تھیں۔ مگر تھیں سگی جیسی۔ عمر میں مجھ سے سال دو سال ضرور بڑی رہی ہوں گی۔ مگر ہیں غضب کی سندر...... کسا کسا بدن...... کالے کالے لمبے بال...... گالوں پر سیب کی لالی ...... مدھ بھرے ہونٹ ایسے کہ چھو دو تو رس ٹپک پڑے۔ میرے پڑوس میں ہی دو کمروں کے ایک چھوٹے سے مکان میں رہتی تھیں۔ ان کے شوہر دور ایک گاؤں کے اسکول میں ٹیچر تھے۔ جو ہر سنیچر کی شام اتوار کی

چھٹی منانے گھر آتے تھے اور سموار کی صبح ہوتے ہی اسکول کے لئے نکل جاتے تھے۔ گھر میں ان کا صرف ایک چھوٹا بھائی تھا۔ میرا ہم جماعت جس سے میری دوستی تھی۔ وہ گھر کے ایک فرد کی طرح میرے یہاں آتا جاتا تھا۔ مجھے بھی اس کے یہاں آنے جانے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ اسی بنا پر بھابی مجھ سے بہت گھل مل گئی تھیں اور ہمارے گھریلو تعلقات بھی خوشگوار بنے ہوئے تھے۔

بھیا جس گاؤں کے اسکول میں پڑھاتے تھے۔ وہ علاقہ بڑا پچھڑا ہوا تھا۔ تمام بنیادی سہولتوں سے محروم۔ میلوں پیدل چلو۔ تب کہیں جا کر پکی سڑک ملتی تھی۔ شروع میں تو بھیا کو بھی بڑی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ رہنے کو نہ ڈھنگ کا مکان ملا اور نہ کھانے پینے کی سہولت نصیب ہوئی۔ لیکن رفتہ رفتہ حالات بدلے اور اسکول کے قریب ہی ایک اچھے شخص کے یہاں رہنا منظور کر لیا۔ اور ان کے بچوں کی پڑھائی کے بدلے بھیا کو رہنے کی سہولت بھی مل گئی، ان کے کھانے پینے کا مسئلہ بھی حل ہو گیا۔

حالانکہ وہ بھابی کو بھی ساتھ رکھنا چاہتے تھے مگر کچھ مجبوریاں تھیں جو آڑے آئیں۔ گھر کی دیکھ بھال۔ کھیت کھلیان کی رکھوالی۔ جانوروں کی حفاظت کا ذمہ۔ کس پر چھوڑ جاتے۔ اسی لئے بھابی کا ساتھ میں رہنا ممکن نہ ہوا۔

اور یہی وجہ تھی کہ جب وہ ہر ہفتہ چھٹیوں میں آتے تو اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ مجھے بھی گھر کا خیال رکھنے کی تاکید کر جاتے۔ بھیا کی ضرورتوں کا مجھے دھیان رہتا۔ وہ جو کچھ بتا کے جاتے ہیں۔ اسے میں اپنا فرض سمجھ کر پورا کرتا۔

بھابی کے ساتھ بھیا کی یہ دوسری شادی تھی۔ پہلی بیوی سے ایک بچی پیدا ہوئی تھی۔ جس کو لے کر گھر میں ایک تنازعہ اٹھ کھڑا ہوا اور بات اتنی بڑھی کہ ساتھ رہنا دشوار ہو گیا اور ایک دن دونوں نے ایک دوسرے سے علیحدگی اختیار کر لی۔ پھر بہت دنوں تک بھیا نے دوسری شادی نہیں کی۔ بیوی کی کمزوری ان کے لئے سوہان روح بنی رہی اور وہ اپنے ناکردہ گناہوں کی سزا جھیلتے رہے۔ مگر برسوں بعد جب گھر والوں کا اصرار بڑھا تو وہ کسی طرح شادی کے لئے راضی ہوئے اور بھابی ان کی زندگی میں داخل ہوئیں۔

شروع میں تو انہوں نے بھابی کو بھی شک کی نگاہوں سے دیکھا اور ان پر کڑی نظر رکھی۔ مگر وہ مضبوط ارادے اور پختہ کردار کی تھیں۔ ان کے خلوص اور خدمت کے جذبے نے بھیا کے سارے شک و

شبہات مٹا دیئے۔

بھابی جلد ہی ان کے مزاج کے سرد و گرم سے واقف ہو گئیں۔ ان کی سخت و مست باتوں میں بھی اپنے پیار کا رنگ بھر کر انہیں لا جواب کر دیتیں اور زندگی کے دن انتظار کے کرب اور قربتوں کے خوشگوار لمحوں کے درمیان بڑے اچھے اور پر سکون گزر رہے تھے۔

بھابی کو جب بھی مجھ سے ملنے کی خواہش ہوتی وہ میرے لئے اپنی ضرورت کا کوئی کام نکال لیتیں۔ بازار سے کوئی دوا منگوانی ہو۔ یا کسی کو گفٹ میں دینے کو کوئی چیز۔ وہ مجھے یاد کر لیتیں۔ ان کے حکم کی تعمیل میں بڑی فرحت ملتی۔ سکھ کا احساس ہوتا۔ دھیرے دھیرے میرے اور بھابی کے درمیان ایک خاموش سا رشتہ قائم ہو گیا۔ ایک انجانا...... ان چاہا رشتہ...... جس کی نہ کوئی حد تھی اور نہ انتہا۔

پھر تو جب بھی مجھے تنہائی اکھرتی اکیلے پن کا احساس ستاتا میں بھابی سے ملنے کا کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈ نکالتا۔

ایک مرتبہ جب میں بھابی سے ملنے ان کے یہاں گیا اور انہیں ڈھونڈتا ہوا ان کے کمرے میں پہونچا تو وہ اپنے بستر پر بے سدھ پڑی تھیں۔ نہ تن بدن کا ہوش اور نہ ادھ کھلے بلوز کی فکر۔ گالوں پر آنکھوں سے ٹپکے کاجل کی لکیر تھی۔

میرے دل میں ایک عجیب سی خواہش جاگ اٹھی اور خود پر قابو پانا مشکل ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ میرے لب اس کے ہونٹوں کو چھوتے بھابی کی آنکھیں کھل گئیں۔ مجھے گھور کر دیکھا اور ساڑی کے پلو درست کرتی ہوئی اٹھ کر بیٹھ گئیں اور ایک طرف ذرا کھسک کر میرے لئے جگہ بنائی اور پاس بٹھا کر پوچھ لیا۔

”کل آئے نہیں۔ میں نے بہت انتظار کیا۔ تمہاری پسند کا حلوہ بنایا تھا !“

”تو کیا ہوا آج لے آیئے۔ ساتھ کھانے کا مزہ ہی کچھ اور آئے گا۔!“

بھابی فرج سے حلوے نکال لائیں اور سامنے طشتری رکھ کر ایک ٹکڑا میرے منہ میں ڈال دیا۔ جواب میں میں نے بھی کئی ٹکڑے ان کے منہ میں ڈالے اور ہم دیر تک باتوں میں اس کی مٹھاس گھولتے رہے۔

ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ میں کئی روز تک بھابی کی طرف نہیں جا سکا۔ پڑھائی کا سلسلہ رہا اور مصروفیات کچھ ایسی رہیں کہ چاہ کر بھی مجھے کہیں جانے کی مہلت نہیں ملی۔ بھابی بڑی بے صبری سے میرا انتظار کرتی رہیں۔ جب رہا نہیں گیا تو مجھے بلانے ایک بچے کو بھیج دیا۔

ان کی خواہش کا احترام مجھ پر لازم تھا۔ میں نے دیر نہیں کی اور جب ان کے کمرے میں قدم رکھا تو مجھے دیکھتے ہی بولیں۔

''کسی کا من اپنے بس میں کرنے کی یہ ادا تم نے کہاں سے سیکھی ہے؟''

''کیا ہوا بھابی؟''

''ہو گا کیا، کئی روز سے دیکھا نہیں تھا، اسی لئے بلوا لیا کہ آتے ہو تو جی بہل جاتا ہے!''

''مگر مجھے تو اپنے آپ کو سنبھالنے میں بڑی مشکل ہوتی ہے۔''

بے اختیار میرے دل کا کرب میری زبان پر آ گیا۔

''یہ تم نے مجھ پر کون سا جادو کر ڈالا ہے کہ سوتے جاگتے تمہارا ہی خواب دیکھتی ہوں؟''

بھابی نے میری باتوں پر دھیان دئے بغیر اپنے من کی بات کہہ دی۔

بھابی کی اسی چاہت نے تو مجھے اپنے سے باندھ رکھا ہے۔ ان کے دل میں میرے لئے جو جگہ اور انسیت ہے اس نے مجھے جینے کا نیا انداز سکھایا ہے۔ اب تو بھابی ہی میرے لئے سب کچھ ہیں۔ میرا پیار...... میری منزل...... میری ساری کائنات۔ مجھے ان کی خوشیوں کے لئے اپنی آنکھوں کی نیند بھی گنوانی پڑے یا ہونٹوں کی مسکراہٹوں کا سودا کرنا پڑے میں نے ہر دکھ جھیل کر انہیں اپنانے کا تہیہ کر رکھا ہے۔ ایک روز میں نے بڑی جسارت کی۔ پوچھ لیا۔

''بھابی! آخر کب تک تم میرے صبر کا امتحان لیتی رہو گی؟ کیوں نہیں ہم لوگ اپنے درمیان سے اجنبیت کی اس دیوار کو مٹا دیں!''

''میں تو تمہیں ہر لمحہ اپنے قریب پاتی ہوں۔ کبھی کسی دوری کا احساس نہیں ہوا۔ پھر یہ صبر کا امتحان کیسا۔ اجنبیت کی یہ دیوار کیسی؟''

''دیکھو بھابی اب اور پہیلی مت بجھاؤ۔ میں تم سے تمہارا فیصلہ جاننا چاہتا ہوں!''

میرے ضبط کا ہر بند ٹوٹ گیا ہے۔

''یہ مت بھولو کہ میں کسی اور کی امانت ہوں۔ ہمیں کوئی قدم ایسا نہیں اٹھانا چاہئے جس سے کہ م ایک دوسرے کی نظروں میں گر جائیں!''

''اگر ایسا ہی تھا تو تم نے مجھے اندھیرے میں کیوں رکھا؟''

دل کے ٹوٹنے کی ایک آواز میرے ہونٹوں پر لرز کر رہ گئی۔ بھابی اپنے چہرے پر رینگتی سکراہٹوں کو دباتے ہوئے بولیں۔

''ہمارے درمیان اپنائیت کا جو رشتہ ہے وہ بڑا پیارا ہے۔ لیکن اس سے بھی قابل احترام ایک رشتہ ہوتا ہے۔ وہ ہے بھابی کا رشتہ...... بہن اور ماں کا رشتہ...... میں تمہیں چاہتی ہوں۔ تمہاری قدر کرتی ہوں تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میرا پیار جھوٹا ہے۔ میری محبت کھوٹی ہے۔''

بھابی کی باتیں سن کر میری سوچوں میں گرہ سی پڑ گئی اور میں کچھ بول نہیں سکا۔ گھر سے باہر قدم رکھتے ہوئے مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس تناؤ سے ہمیشہ کے لئے نجات مل گئی ہو۔ جسے میں پچھلے کئی برسوں سے جھیل رہا تھا۔

قاتل

آج کے اخبار میں کل والی وہ تصویر پھر شائع ہوئی تھی جس کے نیچے لکھا تھا۔ پولس کی حراست سے بھاگنے والے اس مجرم کا سراغ بتانے والے کو پانچ ہزار کا نقد انعام دیا جائے گا۔

تصویر بڑی صاف ستھری تھی۔ چہرے پر بھولپن اور گہری نیلی آنکھوں میں فرشتوں جیسی سادہ لوحی۔ اس کی مسیں بھیگ رہی تھیں۔ بڑے ہی لاابالی انداز میں اس نے بالوں کو اپنی پیشانی پر بکھرا رکھا تھا۔

اخبار میں چھپی اس تصویر کو میں نے کئی بار الٹ پلٹ کر دیکھا تو کچھ ایسا محسوس ہوا کہ اگر بھول کر بھی کبھی وہ میرے سامنے آگیا تو میں یقیناً اسے پہچان لوں گی۔

حالانکہ اس تصویر سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ دور کا بھی واسطہ نہیں۔ پھر بھی نہ جانے کیوں نگاہوں میں اس کی صورت گھومنے لگی تھی۔

اخبار کو ٹیبل پر رکھ کر کچن میں گھس گئی اور آٹا گوندھنے لگی۔ آج سویرے سے کوئی کام کرنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ گھر کے لوگ شادی کی تقریب میں شرکت کے لئے باہر گئے ہوئے تھے۔ دو روز سے آیا بھی نہیں آرہی تھی۔ گھر کے سارے کام مجھے ہی کرنے پڑ رہے تھے۔ آٹا گوندھ کر میں نے گیس چولھا جلایا اور توے پر ابھی روٹی سینک ہی رہی تھی کہ اچانک مجھے لگا جیسے کوئی دروازے کی کنڈی بجا رہا ہو۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔

مگر سامنے کھڑے اجنبی پر نظر پڑتے میں چونک پڑی۔ کہیں یہ وہی لڑکا تو نہیں۔ جس کا چہرہ دیر سے میری یادداشت میں جھلملا رہا تھا۔ وہی سانولا رنگ، لمبا قد، نیلی آنکھیں، دائیں جانب پیشانی پر کٹے کا نشان۔ میں دم بخود کھڑی ایک ٹک اسے گھورتی رہی۔ خوف سے میرے بدن کا رواں رواں کانپ رہا تھا۔ مگر میں نے چہرے پر گھبراہٹ کی کوئی لکیر ابھرنے نہیں دی۔ وہ ایک لمحہ کے لئے رکا۔ چاروں

رف اچٹتی سی نگاہ دوڑائی اور لپک کر اندر آ گیا۔ وہ بے حد گھبرایا ہوا پریشان نظر آ رہا تھا۔ مگر چہرے پر
رموں جیسی کوئی بات نہیں تھی۔ بالکل سیدھا سادہ اور معصوم لگ رہا تھا۔ پسینے میں شرابور، خاموش اور غمگین
ہیں۔

میں بنا پلک جھپکائے اسے دیکھتی رہی۔ کچھ بھی بولتے بن نہ پڑا۔ لیکن کسی نامعلوم خطرے
سے نمٹنے کے لئے میں نے خود کو تیار کر لیا تھا۔

باہر سڑک پر تیز دھوپ بکھری تھی اور لوگ آ جا رہے تھے۔

لڑکا کچھ دیر اپنی اداس آنکھوں سے میری طرف دیکھتا رہا۔ پھر اپنے خشک ہونٹوں پر زبان
پھیرتے ہوئے بولا۔

''میڈم۔ میں مصیبت کا مارا آپ کو تکلیف دینے آ گیا۔ کوئی چور اچکا نہیں ہوں۔ صرف
تھوڑی دیر کے لئے آپ مجھے پناہ دے دیں۔ اندھیرا ہوتے ہی چلا جاؤں گا۔''

میری عقل جیسے ماری گئی تھی۔ گم صم بت بنی اپنی جگہ کھڑی رہی۔ مجھے چپ دیکھ کر اس نے
اپنے اندر ہمت جتائی اور بڑی ملائمیت سے کہا۔

''میڈم۔ اگر آپ برا نہ مانیں تو دروازہ بند کر دوں۔! اور اس نے جواب کا انتظار کئے بغیر اپنی
کانپتی انگلیوں سے چٹخنی چڑھا دی اور رحم طلب نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ مجھے اس کی یہ حرکت
بڑی ناگوار گزری۔ وہ الٹی سیدھی باتوں میں الجھا کر مجھے اندھیرے میں رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ حالانکہ
اس کے بارے میں بہت کچھ جان چکی تھی۔ اخبار میں اس کے متعلق پڑھا ہی تھا اور اس کے فوٹو بھی دیکھے
تھے۔ لیکن اب جو سامنے آیا تو میری ساری احتیاط دھری کی دھری رہ گئی۔ اس کے چہرے پر ایسی وحشت
اور بے چارگی چھائی ہوئی تھی کہ مجھے اس کی معصومیت پر ترس آ گیا۔ اسے اتنا قریب پا کر نہ تو میرے اندر
نفرت پیدا ہوئی اور نہ ہی دل میں کسی طرح کا میل آیا۔

ذہن میں ہر چیز جیسے گڈمڈ ہو کر رہ گئی۔

میں نے ایک بار پھر اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔ خوف اور بھوک سے اس کی آنکھوں کی چمک
ماند پڑ گئی تھی۔

''کل سے بھوکا ہوں۔ اگر آپ کو کوئی تکلیف نہ ہو تو ایک گلاس پانی پلا دیں!''

اس نے مجھے کچھ سوچنے کی مہلت بھی نہیں دی اور کمال خوبصورتی سے کھانے کو مانگ لیا اور میں لاشعوری طور پر حلوے اور کھیر کے ساتھ کئی چپاتیاں اس کے سامنے رکھ دیں اور پھر بلا سوچے چائے بنانے بیٹھ گئی۔

چائے کی پیالی پکڑتے ہوئے اس نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور بڑے سائشتہ لہجے میں کہا......

''اگر آپ نے چائے نہیں لی تو میں بھی نہیں پیونگا۔''

عجب شخص تھا۔ چہرے پر مردنی چھائی تھی۔ مگر ایسی انکساری برت رہا تھا کہ دل پسیج کر رہ گیا اور میں کرسی گھسیٹ کر اس کے پاس بیٹھ گئی۔ چائے کے چند گھونٹ لے کر پیالی کو میں نے میز پر رکھ دیا۔

ٹیبل پر اخبار جوں کا توں پڑا تھا اور چھت سے لٹکے پنکھے کی تیز ہوا میں اس کے پنے پھڑ پھڑا رہے تھے۔ اجنبی کی خوف زدہ نگاہیں سامنے کھلے فوٹو پر جمی تھیں۔

''میڈم۔ جس آدمی کی تصویر آپ دیکھ رہی ہیں/ اگر اچانک وہ سامنے آجائے تو آپ کیا کرینگی؟'' اس نے ڈرے ہوئے لہجے میں میرا دل ٹٹولا۔

''مجھے اپنی نظروں پر بھروسہ ہے۔ یہ تصویر تمہارے سوا کسی اور کی نہیں ہو سکتی۔!'' میں نے جواب دے کر اس کا چہرہ دیکھا تو وہ پہلو بدل کر بولا۔

''پھر بھی آپ مجھ پر دیا کر رہی ہیں۔ مجھ سے ڈر نہیں لگتا کیا۔؟''

''لیکن تمہیں یہاں آنے کی جرائت کیسے ہوئی؟''

''میں جانتا ہوں۔ خاندانی لوگ بڑے شریف اور دردمند ہوتے ہیں۔ پیسے کی خاطر آپ مجھے پولس کے حوالے نہیں کرینگی!''

''لیکن اگر میں نے پولس کو فون کر دیا تو؟''

''آپ کا نمک کھایا ہے۔ جھوٹ نہیں بولوں گا۔ میں نے کسی کا خون نہیں کیا ہے۔ میں مجرم نہیں ہوں۔ مجھے صرف ایک روز کی مہلت چاہئے۔ میں قاتل کو اس کے کئے کی سزا دے لوں۔ تب آپ مجھے

پولس کے حوالے کر دینا۔آپ کو انعام بھی ملے گا اور پولس کی نظروں میں آپ کی عزت بھی بڑھے گی۔!''

اس نے میرے اندر کئی نرم گوشے جگا دیئے اور غم خواری کے جذبات سے مغلوب ہو کر میں نے اس کی بات مان لی اور اسے اپنے یہاں رہنے دیا۔

''یہاں ہمارے گھر کی طرف کوئی جھانکنے بھی نہیں آئے گا۔تم یہیں رکے رہو۔میں باہر دیکھ آتی ہوں۔''

اسے اندر کے ایک کمرے میں چھوڑ کر لان میں آئی۔پھر سڑکوں پر جا کر دیکھ لیا۔تشویش کی کوئی بات نہیں تھی۔سب کچھ اپنی جگہ ٹھیک ٹھاک تھا۔میں کچن میں لوٹ آئی۔مگر جی اسی پر لگا رہا۔

شاید اس نے مجھے کچن جاتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔کچھ دیر بعد وہ بھی ورانڈے سے ہوتا ہوا میرے پاس آ گیا اور مسکین صورت بنائے ہوئے بولا۔

''میڈم مجھے کھانا بنانے آتا ہے۔اگر آپ کہیں تو بنا دوں۔؟''

میرے منع کرنے کے باوجود وہ جوٹھے برتن نل پر دھو کر لے آیا۔اور کچن میں اس کی جگہ رکھ کر چولھے کے پاس بیٹھ گیا۔

یوں ہی باتوں میں اس کے ساتھ کئی گھنٹے گزر گئے۔

شام اوپری منزل کے دریچوں سے کھیلنے لگی۔سڑک کے کنارے کھمبوں میں بجلی کے بلب روشن ہو چکے تھے۔میری مروت اور کشادہ دلی نے اسے اتنا متاثر کر دیا کہ احسان مندی کے بوجھ سے اس کی گردن جھکی جا رہی تھی۔جانے سے پہلے اس نے نہایت نرم اور میٹھے لہجے میں میرا شکریہ ادا کیا اور خاموشی کے ساتھ لمبے لمبے ڈگ بھرتا سڑک کی جانب مڑ کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

تاریکی اس کے گرد گھیرا ڈالے پہرہ دیتی رہی۔

عجب شخص تھا وہ بھی۔آیا تو میں سدھ بدھ کھو بیٹھی اور گیا تو میری اضطرابی کیفیت کو بڑھا گیا۔

رات بستر پر بھی اس کے خیالوں نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔دیر تک اس کی شبیہ ذہن میں بگولے کی طرح ناچتی رہی۔طرح طرح کے خیالات من کو ڈستے رہے۔سوچ سوچ کر میری نیند اچٹ گئی کہ غنڈے تو سب ایک جیسے ہوتے ہیں۔کسی کے ماتھے پر کچھ لکھا نہیں ہوتا۔کمبخت کس طرح سادہ لوح

انسانوں کو ٹھگتے ہیں۔ آنکھوں میں دھول جھونکنا کوئی ان سے سیکھے۔ چند پیسوں کی خاطر آدمی کی جان لینے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ خیر جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ اب اگر وہ پھر کبھی آ گیا تو اسے پاس پھٹکنے بھی نہیں دوں گی۔

پھر نہ جانے کب مجھے نیند آ گئی۔ صبح اٹھی تو طبیعت بوجھل تھی۔ سارا دن اسی اضطرابی کیفیت میں گزر گیا۔ رات بستر پر گئی تو نیند کا یہ حال تھا کہ رہ رہ کر آنکھیں بند اور کھل رہی تھیں تمام رات بستر پر کروٹیں بدلتے گزر گئی۔ صبح آنکھ کھلی تو لگا جیسے کوئی بڑی احتیاط سے دروازے کی کنڈی بجا رہا ہو۔ ایک غیر یقینی سا احساس میرے ضمیر کو جھنجوڑ گیا۔ کہیں آج وہ پھر تو نہیں آ دھمکا۔ میرے قدم لاشعوری طور پر دروازے کی طرف بڑھ گئے اور میں نے آہستہ سے دروازہ کھول دیا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ سرک آئی اور بلا جھجک وہ یوں اندر آ گیا جیسے کوئی راز کی بات ہو یا کوئی اہم واقعہ۔ جسے سنانے کی اسے جلدی ہو۔ پھیکا پھیکا معصوم چہرہ۔ زخم خوردہ آنکھیں۔ ہونٹوں پر اداس مسکراہٹ، کچھ کہنے کی بے تابی میں اس کے ہونٹ پھڑک رہے تھے۔

''میڈم۔ لیجئے میں اپنا وعدہ پورا کرنے آ گیا۔ اب آپ مجھے پولس کے حوالے کر دیں!''

اس کی یہ جرائت دیکھ کر نہ جانے کیسے وہ سوال میری زبان پر آ گیا جسے میں پوچھنا نہیں چاہ رہی تھی۔ جواب میں اس نے گردن جھکا لی اور نگاہیں نیچی کئے بولا۔

''ہاں! میں نے اس آدمی کو ٹھکانے لگا دیا ہے جس نے مجھے اپنی راہ سے ہٹانے کے لئے میرے ایک دیرینہ دوست کا قتل کیا تھا۔ اور اسی قتل کے الزام میں پولس مجھے پکڑ کر لے گئی تھی۔ بات صرف اتنی تھی کہ بستی کا ایک لڑکا میرے دوست کی بہن کے پیچھے پڑا تھا۔ اور اس سے زبردستی شادی کرنا چاہتا تھا۔ لیکن لڑکی کا بھائی میرے حق میں تھا۔''

''تو کیا تم نے اس کا خون کر دیا۔؟'' میں حیرت اور خوف سے بیچ میں ہی بول پڑی۔

''ہاں دوست کی موت کا بدلہ چکانے کا بس یہی ایک راستہ تھا۔!''

''پھر تو بہت برا ہوا!''

''پولس تو مجھ پر شک کر بیٹھی ہے۔ لیکن اسکے پاس کوئی ثبوت نہیں۔ وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی!''

''اگر تم شہر چھوڑ کر کہیں جانا چاہو تو میں یہاں سے نکلنے میں تمہاری مدد کر سکتی ہوں!''

''میرا بھاگنا اچھا نہیں...... میں حالات کا سامنا کرونگا!''

''اب بھی وقت ہے۔ تھوڑی دیر اور سوچ لو۔ تب تک میں تمہارے لئے چائے لے آتی ہوں!''

میں اس کے پاس سے اٹھ کر چائے بنانے چلی گئی اور اس نے ٹیبل پر رکھا فون اٹھالیا اور پولس کو اس فراری مجرم کے پکڑے جانے کی خبر مل گئی۔ جس کی تلاش میں پولس کئی دن سے پریشان تھی۔

پولس کے لئے اپنی لاج بچانے کا اچھا موقع تھا۔ تھانے دار کئی جیپ پولس لے کر آ گئی۔ پولس نے آتے ہی اپنے مورچے سنبھال لئے اور میرے پورے گھر کا محاصرہ کرلیا۔

میں کانپ کر رہ گئی۔ اگر پولس والوں کو یہ شبہ ہو گیا کہ میں نے ایک خطرناک مجرم کو اپنے یہاں پناہ دے رکھی تھی۔ تو میری کتنی بدنامی ہوگی۔ کس قدر رسوائیوں کا مجھے سامنا کرنا ہوگا۔

میں یہی کچھ سوچتی، ڈری سہمی باہر آئی سامنے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور پولس اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈالے میری شکر گزار تھی کہ میں نے ایک فراری مجرم کو پکڑوانے میں اس کی بڑی مدد کی تھی۔

پولس جب اسے اپنی کسٹڈی میں لے کر جانے لگی تو اس کا چہرہ بڑا پرسکون لگ رہا تھا۔ مگر آنکھیں اتنی تیز لو برسا رہی تھیں کہ میرے ہونٹ سوکھنے لگے۔ میں کمرے میں لوٹ آئی اور دریچے کے سامنے کھڑی سوچنے لگی۔

کاش اس نے میری مہربانیوں کا اتنا بڑا صلہ نہیں دیا ہوتا تو آج اس کی شخصیت کے آگے میری انا اس طرح مجروح نہیں ہوتی۔

سوتے جاگتے لمحے

دلربا بھاگ گئی۔

اڑتی ہوئی یہ خبر جب میری سماعت سے ٹکرائی تو ذہن میں بھونچال سا آ گیا۔ حیرت سے آنکھیں پھیل گئیں۔ انجانے خوف کی دھند نے میرے سارے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

دلربا ابھی کمسن تھی۔ اس کا چودھویں سال کی اس کچی عمر میں کسی مرد کے ساتھ گھر سے بھاگ جانا میرے لئے کم تکلیف دہ بات نہیں تھی۔

دلربا کو میں جانتا تھا۔ اسکے لئے میرے دل کے کسی کونے میں نرم گوشہ ضرور تھا۔ اس کے بھائی سے میری دوستی تھی۔ اس کے گھرانے سے میرے تعلقات زیادہ پرانے نہیں تو کچھ نئے بھی نہیں تھے۔

میں پچھلے کئی سال سے اس شہر میں رہ رہا ہوں۔ جب پہلی بار یہاں آیا تھا تب کرائے کے لئے خالی پڑا دو کمروں کا ایک چھوٹا سا مکان جس میں باتھ روم اور کچن کے ساتھ نل کے پانی کی بھی سہولت تھی۔ مجھے نہایت مناسب کرائے پر بڑی آسانی سے مل گیا تھا۔

ابھی اس جگہ رہتے ہوئے مجھے کچھ ہی مہینے گزرے تھے کہ ایک روز صبح سویرے اچانک کسی نے آکر میرے دروازے پر دستک دی۔ معلوم نہیں کون ہے۔ بے وقت کیا لینے آ گیا۔ ذہن میں ایک خیال سا گزرا۔ میں نے بستر سے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ سامنے ایک نوجوان کو کھڑا دیکھ کر اس سے آنے کی وجہ پوچھی تو وہ مجھ سے اس تپاک سے ملا کہ اس کی نیت پر شک کی گنجائش نہیں رہی۔ اسکے چہرے پر بلا کی مسکراہٹ دیکھ کر میں نے سمجھ لیا کو نوجوان بہت اخلاق مند اور بڑی طرح دار شخصیت کا مالک ہے۔ میں اسے ساتھ لے کر کمرے میں آ گیا۔ صوفے پر بیٹھ کر ہم باتیں کرنے لگے۔ تھوڑی دیر کی گفتگو میں ہی ہم ایک دوسرے سے کسی حد تک متعارف ہو چکے تھے۔ اس کا نام حامد تھا۔ کچھ ہی فاصلے پر بستی کی ایک جانب اس کا گھر تھا۔ اسے نوکری کی تلاش تھی۔

میں جس نیم سرکاری دفتر میں ملازم تھا۔ اس میں ایک آسامی کی جگہ خالی ہوئی تھی اور اس عہدے کی امیدواری کے لئے اس نے بھی ایک درخواست دے رکھی تھی اور اسے اس بات کا پتہ چلا تھا کہ کمپنی کے چیرمین کے ساتھ میرے تعلقات بہت اچھے ہیں۔ اسی لئے وہ میرے پاس آیا تھا کہ اس کے لئے سفارش کردوں تو یقیناً اس کا کام ہو جائے گا۔

میں نے یقین کی حد تک اسے بھروسہ دلاتے ہوئے سفارش کا وعدہ بھی کرلیا۔ لیکن میری پیروی کے باوجود اسے نوکری نہیں ملی۔ عین وقت پر چیرمین کا کوئی رشتے دار بھی اس آسامی کا امیدوار نکل آیا اور رعایتاً نوکری اسے دی گئی۔

مجھے دکھ تو ہوا مگر اس شرمندگی کے احساس کو مٹانے کے لئے میں نے حامد کو کہیں نہ کہیں کام پر لگانے کا من بنالیا اور اپنی کوشش تیز کردی۔ بحالیات کے دفتر سے بھی جانکاری لیتا رہا اور اخبار کے اشتہاری کالموں پر بھی نظر رکھی۔

اور اس دن مجھے اپنے خوابوں کی تعبیر پانے کی آس جگی جب اخبار میں بحالی کا ایک اشتہار دیکھا شہر کی ایک پرائیوٹ کمپنی میں چپراسیوں کی کئی جگہیں خالی ہوئی تھیں اور خواہش مند امیدواروں سے درخواستیں طلب کی گئی تھیں۔ میں نے بھی حامد سے کہ کر ایک درخواست ڈلوادی۔

محض چند خالی جگہوں کے لئے ڈھیر سارے امیدوار آئے تھے۔ حامد بھی انٹرویو میں شامل ہوا۔ لیکن سوالوں کی بوچھار میں ناکامی کے باوجود اسے نوکری مل گئی۔ میں خوش تھا اور وہ میرا احسان مند کہ میری محنت رائیگاں نہیں گئی تھی۔ میری اس انسان دوستی کو اس نے بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھا اور اس کے گھر والے بھی میرے اس مخلصانہ رویے سے اس قدر متاثر ہوئے کہ ان کی نگاہوں میں میرے لئے احترام کا جذبہ پیدا ہو گیا۔

میرا مکان حامد کے گھر سے کوئی ایک ڈیڑھ میل کے فاصلے پر رہا ہوگا۔ درمیان میں پرانی عمارتوں کے کچھ کھنڈرات تھے۔ اس سے سٹا ہوا ایک قدیم مندر۔ اور مندر کے احاطے میں پیپل کا ایک پرانا درخت جو ماضی کی یادوں کو تازہ کرنے کے لئے اب بھی اپنی جگہ کھڑا تھا۔ پاس ہی ایک پاٹ دار کنواں جس کی گہرائی بہت تھی۔ مگر اب کسی کام کا نہیں رہا تھا۔ اس سے کچھ دوری پر حامد کا گھر۔ پھر سڑک

کی دونوں جانب مکان اور دکانوں کا سلسلہ۔ اسکے بعد کمپنی کا دفتر۔ آفس آتے جاتے گاہے بگاہے حامد سے میری ملاقات ہو جاتی تھی۔

حامد کے گھر کے حالات ساز گار نہیں تھے۔ اس کے لئے میٹرک سے آگے پڑھائی جاری رکھنا ممکن نہ ہوا۔ آمدنی محدود اور زندگی کے مسائل بے شمار۔ چھ افراد پر مشتمل ایک چھوٹا سا کنبہ۔ بڑی بہن جوان تھی۔ ایک اپاہج بھائی تھا۔ اور ایک کمسن بہن۔ بوڑھا باپ نشے کا عادی۔ ماں دمے کی دائمی مریضہ۔ سبھی ایک چھوٹے سے مکان کے بوسیدہ کمروں میں بڑی تکلیف سے رہتے تھے۔ گرتی ہوئی دیواروں پر لٹکا ہوا سائبان۔ برسات کے دنوں میں کمرے اور آنگن کا فرق مٹا دیتا تھا۔

کبھی اس کا باپ کسی سرکاری دفتر میں ملازم تھا اور اب اسے ملازمت سے سبکدوش ہوئے کئی سال ہو چکے تھے۔ پنشن کے پیسے پر گذر اوقات بڑی مشکل سے چل رہی تھی۔ لیکن اب حامد کو نوکری لگ جانے سے مالی حالت کے سدھرنے اور گھر میں خوشحالی لوٹ آنے کی امید بندھی تھی۔

میں حامد سے نہ جانے کتنی بار مل چکا تھا۔ اسے جانچ اور پرکھ کر دیکھ لیا تھا۔ مجھے اس کے اندر کوئی کمزوری نظر نہیں آئی تھی۔ نہ اس کے کردار میں کوئی جھول پایا نہ اس کی سوچ وفکر میں کوئی گراوٹ دیکھی۔

رفتہ رفتہ ہمارے درمیان کی ساری اجنبیت دور ہوگئی اور ہم ایک دوسرے پر بھروسہ کرنے لگے۔ اور دوستی کی یہ رنگین فضا ہر طرف اپنی بہاروں کے جلوے بکھیرنے لگی۔

حامد کے والدین کی مہربانیاں بھی میرے ساتھ تھیں۔ جب بھی مجھے اس کے یہاں جانے کا اتفاق ہوا۔ میرے منع کرنے کے باوجود اس کے گھر والوں نے میری اچھی تواضع کی۔

اس کی بہن شگوفہ بہت خوبصورت تھی۔ پتہ نہیں اس کی خمار آلود آنکھوں میں کوئی جادو تھا۔ یا میرے اندر کی کوئی کمزوری۔ ایک بار کیا دیکھ لیا کہ بار بار اسے دیکھنے کی خواہش ہونے لگی۔ اور میں موقع کی تلاش میں رہنے لگا۔ وہ مجھے اچھی لگنے لگی تھی۔

یہ حسن اتفاق تھا یا مقدر کا لکھا کہ شگوفہ کی زندگی کی ناؤ کو اب تک کوئی کھویا نہیں ملا تھا۔ اس کے چہرے پر امنگوں کی پژمردہ حسرتوں کو دیکھ کر مجھے اس سے انسیت سی ہوگئی اور میں نے اس کے ہونٹوں پر خوشیاں سجانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ مجھے تو جب بھی موقع ملتا ہم ایک دوسرے سے ملتے

اور باتیں کر کے دل بہلایا کرتے تھے۔ ہمارے اس طرح ملنے جلنے پر نہ تو کسی کو اعتراض تھا اور نہ ہی ہمیں کسی طرح کی مناہی تھی۔ میں نے کبھی شگوفہ کے سامنے اپنے پیار کو ہونٹوں پر مچلنے نہیں دیا۔ وہ اس بات کو اچھی طرح جانتی، بوجھتی اور سمجھتی تھی۔ میں نے تو اپنی چاہت کو دنیا کی نگاہوں سے بچائے رکھا تھا کہ پیار میں کہیں ایسی کوئی بھول نہ ہو جائے۔ جو ہماری بدنامی کا سبب بنے مگر شگوفہ نے نہ تو میری چاہت کا کبھی اقرار کیا اور نہ ہی کبھی انکار۔

بعض اوقات تو اس کا سوکھا برتاؤ اور خشک رویہ مجھے دبدھے میں ڈال دیتا تھا۔ لیکن میں نے نہ کبھی اس کی بے رخی کا برا مانا اور نہ اس کی بے توجہی مجھے کھلی۔

لیکن پچھلے کچھ دنوں سے مجھے شگوفہ کے مزاج میں کچھ تبدیلی سی نظر آ رہی تھی اور حالات بھی بدلے بدلے سے لگ رہے تھے اور لوگوں کی شک بھری نگاہیں بھی مجھ پر پڑنے لگی تھیں۔

تو مجھے سوچنا پڑا کہ آخر ان کی تیز اور چبھتی ہوئی نگاہیں میرا پیچھا کیوں کرنے لگی ہیں۔ میری بے چینی تب اور بڑھ گئی جب ایک روز ایک واقف کار نے مجھے سرِ راہ ٹوک دیا۔

''ارے یار۔ اس سے پہلے تو تم اس گلی کے اتنا چکر نہیں لگاتے تھے۔؟''

''کیوں۔ یہ گلی بدنام ہے کیا۔؟''

''گلی تو نہیں۔ لیکن تم جہاں جاتے ہو وہ گھرانہ ضرور بدنام ہے۔!'' اس کے چہرے پر بڑی شوخ اور معنی خیز مسکراہٹ ناچ رہی تھی۔

''کیسی بدنامی۔؟''

''جب لوگوں کی انگلیاں تم پر اٹھنے لگیں گی تو خود بخود سمجھ جاؤ گے۔!''

اس کی الجھا دینے والی باتوں نے مجھے عجب مخمسے میں ڈال دیا۔ جگہ کی بدنامی سے میرا کیا تعلق۔؟ کیسا واسطہ۔؟ میں نے اس گتھی کو سلجھانے کی بڑی کوشش کی۔ مگر راہیں گرد میں کھو گئیں۔ کوئی سرا ہاتھ نہیں آیا۔ خود میری ذات اپنے وجود میں الجھ کر رہ گئی۔ میرا ذہن شعور سے خالی ہو چکا تھا۔ بہت کچھ سوچنے کی کوشش میں کچھ سمجھ میں نہ آسکا تو ان بے تکی باتوں کو ذہن سے جھٹک کر من کو صاف کر لیا۔

شگوفہ تو میری سانسوں میں بسی تھی اور دل میرا اس کے بس میں تھا۔ اس کے بغیر زندگی سونی

سونی سی لگنے لگی تھی۔ اکیلے پن کے اس جان لیوا احساس سے اکتا کر ایک روز میں نے حامد سے اپنے دل کی بات کہہ دی۔

''حامد بھائی۔ اگر ہماری یہ دوستی رشتے داری میں بدل جائے تو کتنا اچھا ہو؟''

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا جیسے وہ میرا مطلب سمجھ گیا ہو۔ لیکن جواب کی کوشش میں اس کے چہرے کی رنگت ایسی ہوگئی جیسے آدمی سکرات سے گزرتا ہے۔

''کیا تمہیں شگوفہ کے لئے میرا رشتہ پسند نہیں؟'' میں نے اسے خاموش دیکھ کر پوچھا۔

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ اس نے بے حد تھکے ہوئے انداز میں اداس مسکراہٹوں کے ساتھ جواب دیا۔ اس کی نگاہیں جیسے کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

اور حامد کی ماں نے یہ رشتہ نامنظور کر دیا۔

مجھے لگا جیسے کسی بچھو نے مجھے ڈنک مار دیا ہو۔ انکار کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ میں نے کسی احسان کا بدلہ تو نہیں مانگا تھا۔ میں نے تو چاہا تھا کہ دوستی کے اس پودے میں اپنائیت کا پھول کھلاؤں۔ جو برسوں سے ہماری خوشیوں کا محور بنا ہوا ہے۔ لیکن جب منزل قریب آئی تو فاصلے اتنے بڑھ گئے کہ ایک قدم اٹھانا بھی دشوار ہو گیا۔

چوٹ تو دل پر میرے لگی تھی۔ لیکن درد کا احساس شگوفہ کو بھی ہوا تھا۔ دونوں جیسے ایک ہی آگ میں جل رہے تھے۔

دکھوں کو مل کر بانٹنے سے تو غم کا بوجھ بھی ہلکا ہوتا ہے۔ یہی کچھ سوچ کر میں نے کئی بار شگوفہ سے ملنے کا ارادہ کیا۔ کہ تکلیف لاکھ سہی۔ تسلی کے دو بول تو ہماری ڈھارس ضرور بندھائینگے۔ لیکن ہمت جواب دے گئی۔

مگر اس دن۔ جب مجھے دلربا کے گھر سے بھاگ جانے کی خبر ملی تو جی اداس ہو گیا۔ سارے زخم ہرے ہو گئے۔ صدمے سے آنکھیں بھر آئیں اور میں اپنے آپ کو روک نہیں سکا بے اختیار میرے قدم اسکے گھر کی جانب اٹھ گئے۔

شگوفہ گھر میں اکیلی تھی۔ میری آواز پہچان کر اس نے دروازہ کھولا۔ گھر کے لوگ کسی کام سے

پاس میں ہی کہیں گئے ہوئے تھے۔ ہم ٹوٹ کر ایک دوسرے سے ملے۔ میرے احساس پر دکھ کی چھائی گھٹائیں جب کھل کر برسیں تو اس کا دل بھی جیسے صاف ہوگیا۔ ایک لمحہ کے لئے اس نے اپنے وجود کی تمام پرتیں ایک دم سے اتار دیں اور میرے اکتا دینے والے سوالوں سے گھبرائے بغیر نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔

''میں اکیلی کمانے والی۔ اگر شادی کے بندھن میں بندھ گئی تو گھر کا خرچ کیسے چلے گا؟''

''تو کیا میں نے جو کچھ سن رکھا تھا۔ وہ سچ ہے؟''

شگوفہ میرے سوال کا جواب گول کر گئی اور بولی۔

''دلربا کو یہاں سے ہٹانے میں میرے ارادے کو بھی دخل ہے۔ اس طرح وہ کسی ایک سے تو بندھی رہے گی۔ ورنہ اسے بھی وہ سب بھگتنا پڑتا جو میں جھیل رہی ہوں۔!''

میں سکتے میں آ گیا۔

اور کسی بھی جذبے سے عاری اس کا چہرہ بے حد شانت لگ رہا تھا۔

قلندر

قلندر زیادہ پڑھا لکھا تو نہیں تھا۔ مگر اسے اخبار چاٹنے کی عادت تھی اور زبان پر دنیا بھر کی خبریں رکھتا تھا۔

اس روز جب وہ کچہری پہونچا تو صبح کے دس بج چکے تھے۔ برگد کے گھنے درخت کے پھنگیوں پر بکھری دھوپ آنکھوں کو بڑی بھلی لگ رہی تھی۔ اس نے کاندھے سے لٹکے جھولے کو اتار کر برگد کی چھاؤں میں رکھا۔ تھیلے سے پلاسٹک کی کُرسی نکالی اور بندر کی طرف بڑھا دیا۔ بندر نے کرسی پر براجمان ہو کر چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ بندریا اس کے پیچھے دم دبائے بیٹھی تھی۔

قلندر کا قد لمبا اور جسم گٹھا ہوا تھا۔ ڈھلتی عمر تھی۔ داڑھی اور سر کے زیادہ تر بال سفید ہو چکے تھے۔ وہ کالے رنگ کا ڈھیلا ڈھالا کرتا اور اسی رنگ کا تہہ بند باندھے ہوا تھا۔ گلے میں ہڈیوں کی گونتھی ہوئی مالا لٹک رہی تھی۔ اس نے جیب سے چنوٹی نکال کر کھینی بنائی اور اسے ہونٹوں میں رکھ کر ڈگڈگی بجانے لگا۔ لیکن اس کا ذہن کہیں اور بھٹک رہا تھا۔ محض دو روز پہلے کی بات تھی۔ جب اکانت کا اغوا ہوا تھا اور پورے شہر میں کھلبلی سی مچ گئی تھی۔ اکانت اسے اس طور یاد تھا کہ...... ایک بار اس نے اس کے گھر کے سامنے اپنا کھیل جمایا تھا تو اکانت ہی نے اپنے بابا کے کچھ اتارن کپڑے اسے پہننے کو دئے تھے۔

اکانت انگلش میڈیم اسکول کے تیسرے درجے میں پڑھتا تھا۔ اس روز چھٹی کے بعد جب وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ رکشہ گاڑی میں بیٹھا گھر لوٹ رہا تھا تو راستے میں ایک موڑ پر چند نامعلوم بد معاشوں نے ریوالور کا خوف دلا کر رکشہ روک لیا اور اکانت کو ماروتی کار میں ڈال کر اسے اپنے ساتھ لے بھاگے۔

معاملہ اسکولی بچے کا تھا۔ آناً فاناً بات پورے شہر میں پھیل گئی۔ لوگ ششدر رہ گئے۔ پرنسپل نے خود ہی فون پر پولس افسروں سے رابطہ قائم کیا اور ایک چپراسی نے اکانت کے گھر جا کر اس کے والدین کو

اس حادثے کی خبر دے دی۔

اطلاع پاتے ہی پولس جائے حادثہ پر پہونچ گئی۔ حالات کا جائزہ لیا۔ پاس پڑوس کے لوگوں سے پوچھ پاچھ کی۔ پھر رکشہ والے کا بیان لیا اور اکانت کے والدین سے مزید جانکاری لے کر معاملے کو سلجھانے میں جٹ گئی۔ مگر دیر رات تک اکانت کا کوئی اتا پتا نہیں چلا تو بات بڑھ کر سیاست کے گلیارے تک جا پہنچی۔ طالب علموں نے اسے اپنے وقار کا مسئلہ بنالیا اور واقعہ کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے ریاست گیر پیمانے پر ہڑتال کی اپیل کردی اور پھر وہ سب کچھ ہوا جس کا اندازہ تھا۔

صبح ہوتے ہی ہر طرف حکومت مخالف نعرے گونجنے لگے۔ لاؤڈ اسپیکر کی کھردری آواز نے ویران سناٹے کو اور بوجھل بنا دیا۔ ہڑتالی لڑکے گلیوں اور بازاروں میں گھوم گھوم کر لوگوں سے اپنے کاروبار بند رکھنے اور دکانیں نہ کھولنے کی اپیلیں کر رہے تھے۔

قلندر سوچ میں پڑ گیا۔ آج اس کے گھر ہانڈی کیسے چڑھے گی؟ وہ کمائے گا نہیں تو کھائے گا کیا؟ بچے بھوک سے بلکیں گے تو کوئی پوچھنے والا بھی نہیں ہوگا۔ کیا فائدہ ایسی ہڑتال سے؟ جس سے مزدوروں کے آگے کا نوالہ چھن جائے۔ کوئی دکاندار اپنی مرضی سے دکان بند نہیں کرتا اور نہ کاروباری لوگ اپنے تجارتی مرکز ہڑتالیوں کی حمایت میں بند رکھتے ہیں۔ لوگ تو محض اس ڈر سے دکانیں اور کاروباری ادارے نہیں کھولتے کہ کہیں انہیں مظاہرین کی غنڈہ گردی کا شکار ہونا نہ پڑے۔

قلندر نے سر ہلا کر ذہن میں ابھرے خیالوں کو جھٹک دیا۔ راہ پر خطر تھی اور حالات غیر یقینی۔ وہ خالی ہاتھ گھر لوٹ آیا۔

ہڑتال کے دوسرے ہی دن۔ جب حالات معمول پر لوٹ آئے تو قلندر روزی کمانے گھر سے نکلا تھا۔ قلندر کو دیکھ کر بچے تو پہلے ہی برگد کی چھاؤں میں اس کے گرد جمع ہو چکے تھے ڈگڈگی کی آواز سن کر آس پاس کے لوگ بھی اس کی جانب کھسک آئے اور دیکھتے ہی دیکھتے لوگوں کی بھاری بھیڑ اکٹھا ہوگئی۔ تب قلندر نے بائیں دیکھا۔ دائیں دیکھا اور سامنے دور تک نظریں دوڑائیں۔ پھر بھیڑ میں سے ایک بچے کو پکڑ کر اسے ایک جانب فرش پر لٹا دیا اور ایک تیز دھار چھری ہوا میں لہراتے ہوئے بولا۔

آج ہم آپ کے سامنے ایک بے حد خطرناک کھیل دکھانے جا رہے ہیں۔ یہ چھری اس بچے کی

گردن پر چلے گی اور سرتن سے جدا ہو جائے گا۔ مگر تب تک کوئی اپنی جگہ سے ہلے گا نہیں ...... جب تک آخری کھیل ختم نہ ہو جائے۔ ورنہ بچے کا دوبارہ جینا مشکل ہو جائے گا۔!

قلندر نے بچے کے گرد آڑی ترچھی لکیریں کھینچ کر اس کے جسم پر ایک میلی سی چادر ڈال دی اور ڈگڈگی بجانے لگا۔ مجمع پر سناٹا چھایا تھا۔ تماشبین کے چہرے پر خوف کے ساتھ حیرت کے آثار نمایاں تھے۔

چند لمحے بعد قلندر نے بندروں کی رسی ڈھیلی چھوڑ دی۔ بندر اس کی انگلیوں کے اشارے پر اپنے کرتب دکھانے لگا۔ کبھی وہ آنکھیں مٹکاتا، کبھی بانسری بجاتا اور کبھی بندریا کو جھولے جھولاتا اور بندریا خوش ہو کر اس کے گرد ناچتی۔ اسے شراب پلاتی اور پھر دونوں پی کر مستی میں جھومنے لگتے۔

مجمع پر خاموشی چھائی تھی۔ لوگ تماشہ دیکھنے میں منہمک تھے۔ مگر بچہ کو لے کر قلندر کے چہرے پر ایک انجانا سا خوف طاری تھا۔ کئی روز سے بچے کی طبیعت خراب چل رہی تھی۔ مگر کام پر آتے ہوئے اس نے اسے ساتھ رکھ لیا تھا کہ اگر اس نے بچے کے گلے پر چھری کا کمال نہیں دکھایا تو اسے پیسے کون دے گا؟

کچھ ہی دیر بعد...... قلندر نے جھولے سے دواؤں کی شیشیاں نکالیں اور انہیں سامنے فرش پر رکھ کر اس کے گرد جڑی بوٹیاں سجاتے ہوئے بھیڑ پر ایک نظر ڈالی۔ پل دو پل خاموش رہ کر ایک بار پھر اس نے ڈگڈگی بجائی اور مجمع سے مخاطب ہو کر بولا۔

آپ سامنے دواؤں کی یہ شیشیاں دیکھ رہے ہیں۔ ستر قسم کی جڑی بوٹیوں سے بنی یہ درد کی دوا ہے۔ درد چاہے جیسا بھی ہو۔ چوٹ کا ہو۔ کٹے یا جلے کا ہو۔ یا پھر پرانے سے پرانے گٹھیا کا کیوں نہ ہو۔ اس تیل کی مالش سے درد منٹوں میں غائب ہو جاتا ہے۔ اگر کسی کو آزمانا ہے تو سامنے آئے۔ لگانے کی کوئی قیمت نہیں لی جاتی۔ بڑی شیشی دس روپے۔ اور چھوٹی نمونے کی شیشی صرف چھ روپے میں۔ جن بھائیوں کو ضرورت ہو آ کر لے جائیں۔

تبھی بھیڑ سے نکل کر ایک شخص اس کے پاس آیا۔ اس نے دوا کی ایک شیشی خریدی۔ پھر دوسرا آیا۔ اس نے جڑی بوٹیوں کے دو پاکٹ خریدے۔ ان کی دیکھا دیکھی۔ پھر تو کئی لوگ آئے اور دوائیاں خرید کر بھیڑ میں کھڑے تماشہ دیکھنے لگے۔

تھوڑی دیر بعد دواؤں کی بکری تھمی تو قلندر نے ڈگڈگی بجانا شروع کر دیا۔ لوگ آگے کا تماشہ دیکھنے کے لئے ہمہ تن گوش ہو گئے۔ قلندر نے بندر کو پاس بلا کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کے بیاہ کی بات چھیڑ دی۔ مگر وہ شادی کے لئے آمادہ نہیں ہوا۔ لیکن جب قلندر کی جانب سے اسے جہیز کے طور پر بھاری رقم کا آفر ملا تو اس نے آنکھیں مٹکائیں اور اقرار میں سر ہلا دیا۔

قلندر نے بارات سجائی۔ بندر دولھا بنا اور بندریا دلہن۔ دونوں نے قلندر کے گرد کئی پھیرے لگائے اور ایک دوسرے کے گلے میں پھولوں کی مالا ڈال کر شادی کی رسم پوری کی۔

جب کھیل اپنے اختتام کو پہنچا تو قلندر نے ایک میلی سی جھولی ان کے آگے ڈال دی اور دونوں جھولی پسارے لوگوں کے آگے جا کر اپنی کارگزاری کا صلہ مانگنے لگے۔ تماشبین میں سے کچھ نے اپنی اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈالے...... انگلیوں سے ٹٹول کر سکوں کی پہچان کی اور جو سب سے چھوٹا سمجھ میں آیا وہی بندروں کی جھولی میں ڈال دیا۔ مگر بندر کی جھولی بھری نہیں۔ قلندر نے ڈگڈگی بجا کر لوگوں کا دھیان اپنی طرف کھینچا۔

خبردار کوئی اپنی جگہ سے کھسکے گا نہیں ابھی تو اصل تماشہ باقی ہے۔ جب بچے کی گردن پر چھری چلے گی۔ مگر کسی نے قلندر کی باتوں کا کوئی اثر نہیں لیا اور بھیڑ چھٹ گئی۔

قلندر نے فرش پر لیٹے بچے کے جسم پر سے چادر ہٹائی۔ جلدی جلدی اپنے سامان سمیٹے۔ بندروں کی ڈوری تھامی اور جھولے کو شانے سے لٹکا کر گھر کی جانب چل پڑا۔

آج اس کے چہرے پر اداسی تھی۔ اسے اس بات کا دکھ تھا کہ سماج میں نہ تو کلاکار کی کوئی اہمیت ہے نہ اس کے فن کی کوئی قدر و قیمت۔ سرکار بھی ان کی زندگی کے مسائل پر کوئی توجہ نہیں دیتی۔ کل بھی وہ بے گھر تھا۔ آج بھی بے روزگار۔ دن بھر بستی بستی۔ قریہ قریہ گھوم کر اپنے فن کا مظاہرہ کرو...... چوک چوراہے پر بندروں کے کرتب دکھا کر لوگوں کی دل بستگی کے سامان فراہم کرو...... پھر بھی پیٹ نہیں بھرتا...... آج بھی کہیں کوئی مزدور فٹ پاتھ پر اخبار بچھا کر سوتا ہے تو کہیں سے کسی کسان کی بھوک سے مرنے کی خبر آتی ہے۔ مگر ہمارے نیتاؤں کا دعویٰ ہے کہ دیش اناج کے معاملے میں خود کفیل ہو چکا ہے۔ ہم نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ دوسرے ممالک کے لوگ ہمارے تجربات سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

قلندر کے ذہن میں خیالات تھے کہ امنڈ تے چلے آرہے تھے۔ وہ سڑک کے کنارے ایک ہوٹل کے پاس رکا......اندر کچھ گاہک بیٹھے اخبار دیکھ رہے تھے۔ ان میں ہڑتال پر بحث چل رہی تھی۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ حکومت اپنی نااہلی پر پردہ ڈالنے کے لئے بے گناہوں کا خون بہاتی ہے۔ کسی کا کہنا تھا کہ حکومت کو بدنام کرنے کے لئے سیاسی مخالفین اپنے ذرخرید غنڈوں سے شہر کے حالات بگاڑتے ہیں۔ حقیقت چاہے جو ہو......قلندر کو اس سے کیا لینا دینا۔

اس نے ہوٹل کے سامنے رکھے بینچ پر بیٹھ کر دکاندار سے چاہئے کے لئے کہہ دیا۔ چائے آگئی۔ اس نے چائے پی کر کاؤنٹر پر پیسے رکھے اور تازہ دم ہو کر گھر کی طرف چل پڑا۔

ابھی وہ کچھ ہی دور آیا تھا کہ گلی سے نکل کر دو نوجوان اس کے سامنے آگئے۔ ایک نے دوا کی شیشی لوٹائی اور دوسرے نے جڑی بوٹیوں کا ایک پیکٹ۔

قلندر نے دواؤں کو جھولی میں ڈال کر جیب سے ریز گاری نکالی اور نوجوانوں کو ان کے حصے کی رقم دے کر انہیں رخصت کیا۔

اداس من اور بوجھل قدموں سے جب قلندر گھر پہونچا تو اس کی جیب بہت ہلکی تھی اور ساتھ میں وہ بچہ بھی تھا جس کے گلے پر چھری چلنے سے رہ گئی تھی۔

عرفانہ

کبھی کبھی زندگی میں ایسے بھی لمحے آتے ہیں جب آدمی کا جینا مشکل ہو جاتا ہے۔ سارے رشتے ناطے غیر یقینی اور بے معنی ہو کر رہ جاتے ہیں۔ کچھ ایسے ہی حالات سے دوچار تھی عرفانہ۔ وقت کی ستم ظریفی نے اسے اپنے ناکردہ گناہوں کی ایسی سزا دی تھی کہ اس کا ذہن مفلوج ہو کر رہ گیا تھا۔

حالانکہ عرفانہ چاہتی تھی کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ رہے۔ لیکن اس کا معاشرہ اور سماج کے لوگ اسے ایسا کرنے کی اجازت نہیں دے رہے تھے۔

عرفانہ مظفر نگر کے ایک چھوٹے سے قصبہ کوکرا منڈی کی رہنے والی تھی۔ اس کی پرورش جس گھرانے میں ہوئی وہ نہ تو تعلیم یافتہ تھا اور نہ خوش حال۔ گھر کے سبھی معمولی پڑھے لکھے مزدور پیشہ لوگ تھے۔ عرفانہ کا بچپن بھی گاؤں کی دھول بھری سڑکوں پر کھیلتے گزرا تھا۔ جب وہ کچھ بڑی ہوئی اور سوچ میں سمجھداری آئی تو پڑھائی کرنے مکتب جانے لگی۔ جہاں ایک مولوی فرش پر بچھی چٹائی پر بیٹھا سینکڑوں بچوں کو بڑی محنتوں سے پڑھاتا تھا۔ وہ بھی بڑے چاؤ اور بہت لگن سے پڑھنے لگی۔ مگر ابھی اس کی مدرسے کی تعلیم مکمل بھی ہونے نہیں پائی تھی کہ ایک روز اس کی ماں کا سایہ اس کے سر سے اٹھ گیا۔ ماں کی بے وقت موت نے اس کے ہونٹوں کی ہنسی چھین لی۔ دل میں درد بھر دیا۔ مگر اپنوں کی دلجوئی اور باپ کا لاڈو پیار پاکر وہ جلد ہی ماں کا غم بھول گئی۔ مگر پڑھائی کا سلسلہ جاری رکھنا ممکن نہ ہوا۔

گھر کی ذمہ داریوں میں گھری عرفانہ نے مشکل حالات میں بھی جینے کا ڈھنگ سیکھ لیا تھا اور زندگی ایک نئی ڈگر پر چل پڑی تھی۔ اور چلتے چلتے کئی سال گزر گئے۔ جب اس نے عمر کی چودھویں منزل میں قدم رکھا تو پاس کے ایک گاؤں سے ساجد میاں کے لڑکے عامر کا اس کے لئے رشتہ آ گیا۔

عامر موٹر میکنک تھا اور اس کا شمار شہر کے اچھے کاریگروں میں ہوتا تھا۔ روزانہ آمدنی اتنی ہو جاتی تھی کہ اسے کبھی کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ عرفانہ کے باپ کو یہ رشتہ بہت پسند

آیا لڑکا ہر لحاظ سے اچھا تھا اور مانگ بھی اس کی اوقات کے باہر نہیں تھی۔ ساری باتیں بڑی آسانی سے طے پاگئیں اور ایک روز عرفانہ کی شادی پھیراول گاؤں کے عامر کے ساتھ ہوگئی۔

عرفانہ جتنی خوبصورت تھی اتنی ہی اس کی باتوں میں مٹھاس بھی تھی۔ بیاہ کر سسرال آئی تو ساس نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اس کی راہوں میں خوشیوں کے پھول بچھا دیۓ۔ عرفانہ عامر کو بھی بہت پسند آئی۔ وہ اسے بے پناہ اور بے حساب چاہتا تھا۔ عرفانہ بھی اس کے دکھ کو اپنا درد سمجھنے لگی۔ کبھی اس کی مرضی کے خلاف ایسا کوئی قدم نہیں اٹھایا جس سے اس کا من دکھی ہوتا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھ کر عامر کو زندگی بڑی پیاری لگنے لگی۔

رفتہ رفتہ کئی سال گزر گئے۔ بچوں کی آمد سے گھر کی رونق بڑھی تو ضرورتوں میں بھی اضافہ ہونے لگا اور کمر توڑ مہنگائی اس کی خوشحالی کے راستے میں روڑے اٹکانے لگی۔ کبھی کبھار عامر کو بجٹ کے جوڑ توڑ میں کوئی پریشانی ہوتی تو وہ اپنی ضرورتوں کو بھی ٹال دیتا تھا۔

عامر کے کئی ساتھی بڑے شہروں میں میکنک کا کام کرتے تھے۔ جہاں اچھے کاریگروں کی بہت مانگ تھی اور معاوضہ بھی زیادہ ملتا تھا۔ برسوں سے اس کی بھی خواہش تھی کہ وہ بھی مزدوری کمانے باہر کہیں جاتا۔ مگر عرفانہ کی محبت اس کے پاؤں کی زنجیر بنی رہی اور وہ کبھی گھر چھوڑ کر کہیں نہیں گیا۔ لیکن جب بڑھتے ہوئے اخراجات پورا کرنے میں اس کی آمدنی کم پڑنے لگی تو ایک دن وہ بھی کمانے کو باہر نکل گیا جہاں اس کے ساتھیوں نے اس کی بڑی مدد کی اور اسے ایک اچھی جگہ پر کام سے لگا دیا۔

مہینے دو مہینے میں عامر جب گھر لوٹتا تو کمائی کے سارے پیسے وہ عرفانہ کی ہتھیلی پر رکھ دیتا۔ عرفانہ ہوشیار تھی اور خانہ داری میں ماہر۔ گھر چلانے کے ساتھ ساتھ وہ بچوں کی پڑھائی کا بھی خیال رکھنے لگی۔ اسی طرح زندگی کے دن ہنسی خوشی گزرتے رہے۔

دونوں نے دس سال اس طرح گزار لئے کہ رشتے میں نہ کبھی کوئی بدمزگی پیدا ہوئی اور نہ زندگی کو کسی مشکل مرحلے کا سامنا کرنا پڑا اور عرفانہ پانچ بچوں کی ماں بن گئی۔ مگر اٹھائیس سال کی عمر میں بھی اس کے چہرے کی دلکشی برقرار تھی اور چہرے کی یہی دلکشی اس کے لئے عذاب جان بن گئی اور ایک رات اس کی زندگی میں ایسا بھیانک طوفان آیا جس کی تیز لہروں نے اس کے سارے وجود کو لہولہان کر دیا اور وہ کچھ بھی نہیں کر سکی۔

اس روز کوئی آدھی رات گزری ہوگی۔ عرفانہ اپنے بستر پر پڑی گہری نیند میں ڈوبی تھی۔ بچے برآمدے میں پڑی کھاٹوں پر سوئے تھے کہ اس کے سسر نے کمرے میں گھس کر اسے اپنی ہوس کا نشانہ بنالیا اور وہ چیخ چلا بھی نہ سکی۔ شرم وحیا اور رسوائی کے خوف نے اس کے منھ پر تالے ڈال دیے۔ دل میں درد اور آنکھوں میں آنسو لئے۔ وہ حیران اور پریشان سر پکڑے بیٹھی سوچتی رہ گئی۔ اب بچا کیا تھا۔ ایک ان دیکھا۔ انچاہا درد...... جس کی ٹیس ساری عمر اسے خون کے آنسو رلاتی رہے گی۔

اتفاق سے دوسرے ہی دن عامر کام پر سے لوٹ آیا۔ عرفانہ اپنے دکھ برداشت نہ کر سکی اور رو روکر اس نے اسے سب کچھ بتا دیا۔ نفرت اور غصے کی شدت سے عامر کی آنکھیں لال ہو گئیں۔ اسے اپنے آپ پر قابو نہیں رہا۔ مگر اس دکھ سے نجات پانے کی کوئی صورت اسے نظر نہیں آئی تو وہ مایوس اور دل برداشتہ ہر کر جیتے جی جیسے مر گیا۔

کانوں کان فرزانہ کے بھائی کو بھی یہ خبر مل گئی اور بات ایک چھوٹے سے گاؤں کی چہار دیواری سے نکل کر شہر کے کونے کونے میں پھیل گئی۔

واقعہ بڑا دل دوز اور شرمناک تھا۔ سب کے کان کھڑے ہو گئے۔ لوگوں نے اسے گاؤں اور سماج کے وقار کا مسئلہ بنالیا اور مسئلے کے حل کی تلاش میں سب ایک جٹ ہو گئے۔ جواب میں گاؤں کے ایک عالم نے فتویٰ دے دیا کہ...... اب عرفانہ اپنے شوہر پر حرام ہوگئی۔

میڈیا والوں کو تو صرف بھنک ملنے کی دیر تھی۔ فرقہ پرستوں کو زہر افشانی کا موقع مل گیا۔ اخبار کے مقامی نمائندوں نے اس واقعہ میں اپنی مرضی کے مطابق ایسا رنگ بھرا کہ یہ خبر سب کی دلچسپی کا باعث بن گئی۔ کیا اخبار...... کیا ریڈیو...... کیا ٹیلی ویژن کے نمائندے...... سب ہاتھ دھو کر عرفانہ کے پیچھے پڑ گئے اور اپنے آدرشوں کو بھول کر ایسی ذہنی پستی کا ثبوت دیا کہ ان کی اوچھی حرکتوں سے ایک خالص شرعی مسئلہ ایک سنگین معاملہ بن گیا۔ ایسا سنگین دلچسپ اور پراسرار کہ جتنا اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کی گئی۔ معاملہ اتنا ہی الجھتا چلا گیا۔

کسی فرقے کے نزدیک عرفانہ اپنے شوہر کے لئے حرام قرار دے دی گئی تو دوسرے مسلک کے ماننے والوں نے اسے اپنے شوہر کے لئے جائز ٹھہرایا۔ ایک دینی ادارہ نے تو اسے اپنی مرضی سے کہیں اور شادی کرنے کی صلاح دے دی۔

ہر مسلک کے علماء اپنی اپنی سمجھ اور عقیدے کے مطابق فتویٰ کی حمایت اور مخالفت میں بیان بازی کرنے لگے۔ بات بگاڑنے میں کوئی کسی سے پیچھے نہیں رہا۔ ان کی شہ پاکر فرقہ پرستوں نے عرفانہ سے ہمدردی کا ڈھونگ رچا کر۔ بند کمرے میں قید اس ایک لمحے کی ایسی منظر کشی کی کہ خواہ مخواہ لوگ معاملے میں دلچسپی لینے لگے اور دنیا کی ساری خبریں اس کے آگے پھیکی پڑ گئیں۔

ہفتوں اخبار کی سرخیوں اور ٹیلی ویژن کے پردے پر فتویٰ کی آڑ میں عرفانہ اور اس کے معاشرے کی تذلیل کا سلسلہ جاری رہا اور لوگ شریعت کی دھجیاں اڑاتے رہے۔

حالانکہ فتوی دینا۔ کسی مسجد کے امام یا کسی مدرسے کے معلم کا کام نہیں۔ فتوی صادر کرنے کا اختیار تو صرف جہاندیدہ، صاحب الرائے مفتیوں کو ہی حاصل ہے۔ لیکن یہاں تو معاملہ ہی اس کے برعکس تھا۔ شعوری طور پر ہو یا غیر شعوری طور پر...... چھان بین اور حقیقت حال کا پتہ لگائے بغیر فتویٰ اتنی عجلت میں دیا گیا کہ ایک ہی مسئلہ پر متضاد فیصلے جگ ہنسائی کا سبب بن گئے اور سب کچھ مذاق بن کر رہ گیا۔

آبروریزی کے اس واقعہ نے عرفانہ کو ایسے گھاؤ دئے تھے جس کا بھرنا مشکل تھا۔ اس کی تو قسمت ہی پھوٹی تھی جو اسے یہ دن دیکھنے پڑے اور ایک روز اسے مجبوراً اپنے سسر کے خلاف تھانہ میں رپورٹ درج کرانی پڑی اور معاملہ عدالت تک جا پہنچا۔

لیکن جلد ہی یہ حقیقت کھل کر سامنے آ گئی کہ عرفانہ کے ساتھ ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ وہ تو صرف عامر اور اس کے باپ کے درمیان گھر کے بٹوارے کا جھگڑا تھا اور عرفانہ نے سسر کو یہ دھمکی دے رکھی تھی کہ اگر اس نے اسے گھر سے بے دخل کرنے کی کوشش کی تو وہ اسے ایسا سبق سکھائے گی کہ وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گا۔

حقیقت چاہے جو ہو۔ اب عرفانہ اپنی بھول پر پچھتائے یا آنسو بہائے۔ کچھ فرق نہیں پڑتا۔ اب تو معاملہ عدالت کے زیر غور ہے۔ اور عدالت گواہوں کے بیانات اور شواہد کی بنیاد پر ہی کوئی فیصلہ کرے گی۔

اگر نچلی عدالت نے عرفانہ کے سسر کو سزا سنا بھی دی تو کیا۔ وہ تو اس فیصلے کے خلاف اونچی عدالتوں میں ضرور جائے گا۔ ابھی انصاف کے سبھی دروازے کھلے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ عدالت کو آخری فیصلہ تک پہنچنے میں کتنا وقت لگے گا...... کتنے سال درکار ہونگے۔ یہ کہنا مشکل ہے! بہت مشکل!!

بہاروں کی واپسی

وہ ایک لمحہ کے لئے دروازے پر رکی۔ نظریں گھما کر ادھر اُدھر دیکھا اور ایک دم گھبرائی ہوئی سی اس کے کمرے میں گھس گئی۔

کشور بستر پر بیٹھا کورٹ جانے کے لئے فائل درست کر رہا تھا۔ کویتا کو غیر متوقع طور پر اپنے سامنے دیکھ کر چونک پڑا اور کئی وسوسے ایک ساتھ اس کے ذہن میں کوند گئے۔ کہیں کویتا اپنی غلطیوں پر نادم ہو کر اس سے معافی مانگنے تو نہیں آ گئی۔ یا پھر ہو سکتا ہے اس کے ساتھ کوئی بڑا حادثہ پیش آیا ہو۔ ورنہ وہ اس طرح یہاں آنے والی تو تھی نہیں۔ اچانک اس نے پوچھ لیا۔

''تمہیں یہاں آنے کی جرائت کیسے ہوئی؟''

''تم کسی خوش فہمی میں مت پڑو۔!''

''میں تمہارے آنے کا مقصد جاننا چاہتا ہوں!''

''دیکھو میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ میں تمہیں صرف یہ بتانے آئی ہوں کہ اگر تم نے مجھ سے بچہ چھیننے کی کوشش کی تو اس سے پہلے کہ کورٹ اپنا فیصلہ سنائے۔ میں چلتی ٹرین کے نیچے بچے کو پٹری پر لٹا کر خود بھی سو جاؤں گی۔!'' کویتا نے اپنی پھولتی سانسوں پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ اس کے تیور ایسے تھے جیسے آج وہ کچھ کر کے ہی رہے گی۔

''تو تم مجھے اس بات سے ڈرانے آئی ہو کہ تمہاری موت کے بعد لوگ مجھے اپنے بال بچوں کا قاتل نہ سمجھنے لگیں۔!

''میں جا رہی ہوں اور تم میرے آنے کا جو مطلب چاہو نکال سکتے ہو......!''

کویتا جس تیزی سے آئی تھی۔ اسی تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔

کشور دم بخود رہ گیا۔ آج ان کے مقدمے کا فیصلہ تھا۔

پچھلے کئی سال سے لورکورٹ میں کشور اور کویتا کے مابین مقدمہ چل رہا تھا جس سے ذہنی تناؤ تو بڑھا ہی تھا۔ ان کے تعلقات بھی اتنے کشیدہ ہو گئے تھے کہ ایک دوسرے کو بھول جانے میں ہی اپنی عافیت نظر آ رہی تھی۔ ۔ بے یقینی کے اس ماحول میں بنٹی پر دھیان کون دیتا۔ اس کی زندگی تو داؤں پر لگی تھی اور مستقبل بھی گہن کی ذد میں آ گیا تھا۔

کویتا انگلش اسکول میں پڑھاتی تھی ۔ جہاں اسے اچھی تنخواہ کے ساتھ کچھ بنیادی سہولتیں بھی ملی ہوئی تھیں۔ مگر کشور تو لکچرار ہو کر بھی جیسے بیکار تھا۔ تنخواہ کے نام پر دو چار سو روپے ماہانہ مل جاتے تھے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ کبھی کبھار تو کوئی مہینہ خالی بھی چلا جاتا تھا۔ تب کشور کو اپنی ضرورت کے لئے کویتا کی طرف دیکھنا پڑتا تھا اور کویتا کو گھر کے اخراجات کے ساتھ اس کے فاضل خرچ بھی برداشت کرنے پڑتے تھے۔ یہ الگ بات تھی کہ جب کبھی کشور کا خرچ اعتدال سے بڑھ جاتا تو وہ بجٹ کے جوڑ توڑ میں تھوڑا غیر متوازن ضرور ہو جاتی ۔ جس سے اس کا لہجہ بدل جاتا اور باتوں میں کڑواہٹ گھل جاتی ۔ مگر جھگڑے کبھی طول نہیں کھینچتے اور بات بگڑنے سے پہلے ہی دونوں ایک دوسرے کو منا لیتے۔

مگر اس دن ہوا تو کچھ نہیں تھا۔ صرف دوستوں کی ضیافت میں اٹھے کشور کے ہوٹل بل پر وہ ایک ذرا سا اعتراض کیا کر بیٹھی کہ کشور نے غصے میں آ کر اس پر ہاتھ اٹھا لیا۔ کویتا تلملا کر رہ گئی۔ آنکھوں مین آنسو بھر آئے۔ دکھ کی ایک گرہ سی ڈال دی کشور نے۔ اس کے من میں جہاں اس کی کوئی پوچھ نہیں۔ قدر نہیں۔ وہ اس گھر میں رہ کر زندگی کے دن کیسے کاٹے گی؟ فالتو شئے کی طرح آدمی کی ٹھوکروں میں پڑے رہنا اسے پسند نہیں تھا۔ وہ اپنی خوشیاں اور گھر بار...... سب کچھ تیاگ دے گی اور اس کی دنیا سے اتنی دور نکل جائے گی۔ جہاں خواب وخیال میں بھی کشور کا گزر ممکن نہ ہو۔

وہ سارا دن پریشان رہی۔ کشور کے رویے نے اس کی سوچ کا ہر انداز بدل دیا تھا۔ وہ اس کی تنہائی میں اپنی یادوں کا زہر بھر کر اپنے من کو شانت کرنے کے لئے بے قرار ہو اٹھی۔ اور پھر شام کی ایک خبر نے اسے وہ موقع فراہم کر ہی دیا۔ جس کے انتظار میں وہ دن بھر سوچ کی بھٹی میں سلگتی رہی تھی۔

اس دن کشور کے کالج کا سالانہ جلسہ تھا جس کی تیاری میں وہ کئی دن تک بے حد مصروف رہا تھا۔ جلسے کی صدارت کے لئے صوبائی وزیر تعلیم کی منظوری مل چکی تھی ۔ اس موقع پر انہیں کالج کی نئی

عمارت کا سنگ بنیاد بھی رکھنا تھا۔ مگر عین وقت پر جہاز میں کچھ ٹیکنیکل خرابی نکل آئی۔ جس کے باعث پرواز میں تھوڑی تاخیر ہوگئی۔ پھر بھی انہوں نے اپنا پروگرام رد نہیں کیا۔ مگر آئے ذرا دیر سے اور کالج کا سارا پروگرام بے ترتیب ہوگیا۔ جلسے کی کارروائی بھی دیر سے شروع کرنی پڑی۔

اس لئے کشور نے دن رہتے کویتا کو فون پر اپنے دیر سے گھر لوٹنے کی اطلاع دے دی تھی۔ کویتا کو اس سے اچھا موقع اور کیا ملتا۔ اس نے میکے جانے کی تیاری شروع کردی۔ شام ہوتے ہی بچے کو سنبھالا اور ہاتھ میں اٹیچی تھامے گھر سے نکل گئی۔ راستے میں بس اسٹاپ پڑتا تھا۔ وہ چند لمحے کے لئے ایک جگہ رکی۔ مگر بس اڈے پر بیٹھ کر گاڑی کا انتظار کرنا اسے کچھ اچھا نہیں لگا۔ اور وہ کوئی سواری گاڑی پکڑنے اسٹیشن کی طرف بڑھ گئی۔

مگر میکے میں بھی اسے اطمینان نصیب نہیں ہوا۔ کویتا کے اس طرح چلے جانے کو چوری کا ایک نام دے کر کشور نے اس پر کئی الزام تھوپ دئے۔ کویتا غصے میں تو تھی ہی۔ ان افواہوں کو سن کر اور بھی آگ بگولہ ہوگئی۔ وہ کشور کو خوشیاں دے کر اپنا جیون دکھی بنانا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے کشور سے علیحدگی حاصل کرنے کا مکمل ارادہ کرلیا اور اس کے خلاف کورٹ میں ایک عرضی داخل کردی۔ وکیل اور عدالت کے چکر میں پھنسا کر اسے پریشان بنائے رکھا۔

کشور بھی یوں چپ بیٹھنے والا نہیں تھا۔ کویتا گھر سے بھاگ کر اپنے پیچھے اس کے لئے جو رسوائی چھوڑ گئی تھی۔ اب اس کی اذیت برداشت کرنا اس کے لئے مشکل ہو رہا تھا۔ اس نے کویتا کو اس کی اوقات بتانے کے لئے اس سے بیٹے کا پیار چھین لینے کا عہد کرلیا اور بنٹی پر اپنا دعویٰ جتاتے ہوئے کورٹ سے بیٹے کو اپنے حوالے کرنے کی مانگ کردی۔

دھیرے دھیرے وقت سرکتا رہا۔ دونوں اپنی اپنی ضد پر قائم رہے۔ کسی نے اس خلیج کو پاٹنے کی کوئی کوشش نہیں کی اور بیٹے کے بٹوارے کو لے کر معاملہ سلٹنے کے بجائے طول پکڑتا گیا۔ دونوں کے بیچ ایک لکشمن ریکھا سی کھنچ گئی۔

پیشی کے دن دونوں علیحدہ علیحدہ اپنے وکیلوں کے ہمراہ عدالت آتے اور ایک ہی اجلاس کی الگ الگ بنچوں پر بیٹھ کر مقدمے کی کارروائیوں میں حصہ لیتے اور پھر چپ چاپ ایک دوسرے سے ملے

بغیر گھروں کو لوٹ جاتے۔ جیسے ریل کی دو پٹریاں ہوں۔ جو چلتی تو ایک ساتھ ہیں مگر ملتی کبھی نہیں۔

حالانکہ کشور نے کئی بار چاہا کہ وہ کویتا سے مل کر اس رشتے کو ٹوٹنے سے بچا لے۔ بات بگاڑنے سے کیا فائدہ۔ جھگڑے کہاں نہیں ہوتے؟ مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ایک ذرا سی بھول کی خاطر آدمی زندگی بھر کا ناطہ ہی توڑ لے۔ لیکن جب بھی اس نے کچھ کہنا چاہا کویتا اس کے سامنے سے یوں نکل گئی جیسے دو اجنبی آمنے سامنے آ جانے پر راستہ بدل لیتے ہیں۔

دن یوں ہی گزرتے رہے۔ مگر دلوں کے درمیان پڑی دراڑ کم نہ ہوئی۔ کورٹ اور وکیل کے چکر میں کئی سال کا عرصہ بیت گیا۔ جب بنٹی دوڑنے بھاگنے لگا۔ تب مقدمے کی آخری سنوائی ختم ہوئی اور اگلی پیشی کا دن فیصلے کے لئے مقرر رہوا۔ آج عدالت کو ان کے مقدمے کا فیصلہ سنانا تھا۔

حالانکہ کویتا گھر سے نکلی تو تھی کورٹ جانے کے ارادے سے مگر ٹیکسی پر بیٹھ جانے کے بعد نہ جانے اس کے من میں کیا آیا کہ عدالت جانے کے بجائے وہ کشور کے یہاں پہونچ گئی۔

دروازے پر رک کر ایک لمحہ کے لئے اس نے ادھر اُدھر دیکھا اور بے تحاشہ اس کے کمرے میں گھس گئی اور اپنی پھولتی ہوئی سانسوں پر قابو پاتے ہوئے اس نے نہایت روکھے اور سپاٹ لہجے میں اسے اپنا فیصلہ سنایا اور جس تیزی سے آئی تھی۔ اسی تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔

کشور دم بخود رہ گیا۔ کویتا کے وہ جملے دھماکوں کی طرح اس کے ذہن میں گونج رہے تھے ”اگر تم نے مجھ سے بچہ چھیننے کی کوشش کی تو اس سے پہلے کہ کورٹ اپنا فیصلہ سنائے میں چلتی ٹرین کے نیچے پٹری پر بچے کو لٹا کر خود بھی سو جاؤں گی! کہیں کویتا کوئی غلط قدم اٹھا نہ لے۔ ایک ادھورے خیال نے اس کے ذہن میں ابھر کر اسے بوکھلا دیا۔ وہ چونک کر بدحواس سا اپنی جگہ سے اٹھا۔ بھاگ کر سڑک پر آیا۔ مگر کویتا کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ اس نے جلدی سے اپنے ایک دوست کا اسکوٹر لیا اور تیزی سے گاڑی اس کی سمت بڑھا دی۔ جدھر کویتا کے جانے کا اندازہ تھا۔ کچھ دیر بعد ہی اسے وہ آٹو رکشا نظر آ گیا جس پر بیٹھ کر کویتا اپنے گھر کی طرف جا رہی تھی۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ اسے اوور ٹیک کرتا گاڑی کویتا کے بنگلے سے جا لگی۔ کویتا بل چکا کر جوں ہی گھر میں داخل ہوئی کشور بھی اسکوٹر سے اتر کر اس کی طرف لپکا۔ مانوس سی آہٹ پا کر کویتا ایک لمحہ کے لئے مڑی۔

دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ سپاٹ چہرے پر دکھ کی پرچھائیں بے چین راتوں کی کہانیاں سنا رہی

تھیں۔ ویران آنکھوں میں اپنے غیر یقینی انجام کو دیکھ کر دونوں اندر تک کانپ گئے۔ کویتا نگاہیں نیچی کئے بنا کچھ بولے آگے بڑھ گئی۔ تبھی نہ جانے کیسے بنٹی ماں کی بھنک پا کر ادھر آنکلا تو کشور نے بے اختیار اسے اٹھا کر اپنی بانہوں میں سنبھال لیا اور اسے لئے ہوئے کویتا کے پیچھے پیچھے اس کے کمرے میں چلا آیا اور بنٹی کو ہاتھوں میں جھلا کر اس پر شفقتوں کی ایسی بارش کر دی کہ کویتا بے قابو ہو گئی اور پیار کی اس جھڑی میں خود کو بھیگنے سے بچانا اس کے لئے مشکل ہو گیا۔ اس کی آنکھیں غمناک ہو گئیں۔ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولی۔

''تم نے بچے کو مجھ سے الگ کرنے کے ایسے اوچھے طریقے اپنائے ہیں کہ میرا جینا دشوار کر دیا ہے۔ چین سے مرنے بھی نہیں دیتے!''

''میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے جو ایسا سوچتی ہو؟'' اس نے کویتا کی آنکھوں میں جھانک کر بڑی اپنائیت سے پوچھا تو کویتا آبدیدہ ہو کو بولی۔

''میرا دل دکھا کر تمہیں کیا ملا؟''

''گھریلو جھگڑے کہاں نہیں ہوتے کویتا...... لیکن ذرا سی غلطی پر کسی کو بن باس کی سزا دے کر خود بن باس بھوگنا کہاں کی عقلمندی ہے؟'' کشور نے اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تو وہ اس کے لہجے کی نرمی میں گھل کر سب کچھ بھول گئی اور ندامت بھرے لہجے میں بولی۔

''تم ٹھیک کہتے ہو کشور۔ کہیں مجھ سے کوئی بھول ضرور ہوئی ہے۔ ورنہ ہمیں یہ دن دیکھنے نہیں پڑتے۔''

''اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں کویتا...... ساری غلطی میری ہے!''

اس نے کویتا کے من کی پھانس نکال کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیا اور بچھڑے دل ملنے کو بے تاب ہو گئے۔ پہل کشور نے ہی کی۔ اسے شانے سے پکڑ کر اپنی طرف گھماتے ہوئے کہا۔

''اپنے گھر کے دروازے تو کب سے تمہاری راہ دیکھ رہے ہیں کویتا...... آؤ ہم لوگ اپنے سارے دکھ سکھ آپس میں بانٹ لیں!''

کشور کی گیلی آنکھوں نے کویتا کے ضبط کا ہر بند توڑ دیا اور تنہائی کے پل صراط سے گزر کر جوں ہی کشور نے اسے سنبھالا دیا تو کویتا اس کی چھاتی سے لگ کر یوں پھپک اٹھی جیسے دونوں اپنے بن باس کا غم بھول گئے ہوں۔

ناسُور

درجہ حرارت جب نقطۂ انجماد سے نیچے آتا ہے تب پانی برف بننے لگتا ہے۔ لیکن میرے جسم کا درجہ حرارت اتنا کم تو نہیں پھر بھی لہونسوں میں منجمد ہوتا ہوا محسوس ہو رہا ہے۔

حرارت پہنچنے سے تازہ بہتے ہوئے خون کی سُرخی سیاہی میں بدل جاتی ہے اور ہوا کے میل میں آنے سے خون جمنے لگتا ہے۔ زندگی میں صرف ایک بار یہ منظر دیکھا تھا مگر شعور کی تہوں میں یہ منظر تکرار کے ساتھ اب تک کیوں زندہ ہے؟ شاید یہ بات صحیح ہے کہ آدمی اپنی طبعی موت سے پہلے بھی ہزاروں بار مر چکا ہوتا ہے۔ میرا یہ احساس میرا وہم تو نہیں ہو سکتا۔ کہ میں مر چکا ہوں۔ کس کو معلوم کہ مردوں کی قوتِ احساس زندوں کی بہ نسبت زیادہ شدید اور زیادہ تیز ہو جاتی ہے۔ اگر کوئی اس تجربے کا اظہار ایک بار اور صرف ایک بار کر سکتا تو شاید یہ حقیقت معمہ نہ رہتی۔

لیکن یہ موت کیسی ہے کہ وہ مر کر بھی جی رہی ہے۔ موت کی بھی تو کئی اقسام ہوتی ہیں۔ اس کی موت کس زمرے میں آتی ہے، یہ فیصلہ کرنا ذرا دشوار ہے۔ آدمی موت سے انکار نہیں کر سکتا۔ وقت ایک ایک پل ایک ایک لمحے کا سفر طئے کر کے موت اور زندگی کو ایک دوسرے سے ملاتا ہے اور اس میں برسوں لگتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ہر لمحہ انسان اپنے اندر مرتا رہتا ہے۔ مگر مکمل موت میں تو برسوں لگ جاتے ہیں۔ لیکن اُس کی موت نہ لمحوں کی موت تھی نہ برسوں کی۔ لمحوں لمحوں میں ٹوٹتا ہوا آدمی پوری طرح مدت پر جا کر بکھر جاتا ہے۔ اسکی موت کچھ ایسی ہی تھی جیسے تیز آندھی میں کوئی برگِ سبز شاخ سے ٹوٹ کر گرے اور شاخ سے بے تعلق ہو جانے کے باوجود زرد نہ ہو۔ زندگی اور موت کی درمیانی منزل۔ اور ایسا اسی وقت ہوتا ہے جب یکا یک کسی طرف سے دلوں میں نفرت کی آندھیاں چلنے لگتی ہیں۔

جیسے جیسے دن ڈھلتا ہے، سایہ بڑھنے لگتا ہے اور پھر میرے سارے وجود کو اپنی آغوش میں دبوچ لیتا ہے۔ میں کانپ اٹھتا ہوں۔ ہنگاموں میں گھر جاتا ہوں۔ چاروں طرف شور ہی شور سنائی دیتا ہے۔

خوف، دہشت، سراسیمگی، عجب بھیانک منظر ہے۔ فضاؤں میں پھیلی ہوئی سسکیاں اور آہ وزاری۔ دماغ پر پے در پے ضربیں لگا رہی ہیں۔

لمبے چھرے کی نوک سے خون ٹپک رہا ہے۔

انگریزی ہٹاؤ تحریک کا میں مخالف ہی سہی، پھر بھی میں نے اس کی حمایت میں نکلنے والے جلوس کا ساتھ دیا۔ لمبا جلوس اونچے نعرے لگاتا ہوا عام شاہراہوں سے گزرتا رہا۔ راہ میں جہاں بھی انگریزی میں لکھے سائن بورڈ، پوسٹر یا نیم پلیٹ ملے تارکول پھیر پھیر کر انکی ہیئت بدل دی گئی۔ لیکن راستے میں ایک جگہ جب جلوس کو مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا تو ہجوم مشتعل ہو گیا۔ نیا خون۔ نئی جوانی۔ آن واحد میں آدمیت کے جو صدیوں پرانے رشتے تھے ٹوٹ گئے۔ اور شدید طوفان میں بڑے بڑے پیڑ اکھڑ گئے، شاخوں اور پتوں کا تو پوچھنا ہی کیا۔ ہوا نے کچھ نہ چھوڑا۔ سب کچھ گرد وغبار بن کر اڑ گیا۔ سائے اتنے طویل ہوئے کہ ہر چیز سیاہی کی تہہ میں چھپ گئی۔ اور وہ ایک برگِ نوخیز پتا ہے۔ ہوا اسے کہاں اُڑا کر لے گئی۔ میری صداؤں نے اسے ہر جگہ تلاش کیا۔ اس کی بازیافت تو نہیں ہوئی مجھے اپنی بازگشت ملی اور تب مجھ میں کا وہ فنکار مر گیا جو خوبصورت علامتوں اور دل کش استعاروں کا اسلوب رکھتا تھا۔

میرا اور اس کا رشتہ کتنا گہرا اور نزدیکی تھا۔ اسکی گمشدگی نے ذہن میں بگولے بھر دیئے۔ اب تو کچھ بھی باقی نہ رہا تھا۔ جس طرف نگاہ اُٹھتی چیزوں کی ہیئت بدلی بدلی سی لگتی۔ ہر شئے سرخ خون میں ڈوبی نظر آتی۔ پتا نہیں منظر بدل گیا تھا یا میری نظر۔

ساری بستی چھان ماری۔ اپنے پرایوں سے معلوم کیا۔ لیکن اس کا کہیں کچھ پتا نہیں تھا۔ تھک ہار کر ٹرین سے واپس ہو رہا تھا کہ اچانک میرے ذہن میں پڑے آبلوں نے خطرناک صورت اختیار کر لی اور مجھے اپنے آپ پر قابو نہیں رہا۔ اپنے حمایتیوں کے ساتھ مل کر میں نے ڈبّے سے چن چن کر مسافروں کو پھینکنا شروع کر دیا۔ کسی کو دروازے سے اور کسی کو کھڑکی کے ذریعے باہر دھکیل دیا۔ جب ہمارا ڈبہ مخالف لوگوں سے صاف ہو گیا تو میں نے باہر جھانک کر دیکھا۔ پیچھے خون میں لت پت کئی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ مجھے اطمینان سا ہوا۔ میں نے رادھا کا بدلہ لے لیا تھا۔ اب میں خوش تھا، بہت خوش۔

چیزوں کی پُراسرار ہیئت اپنے اصلی رنگ پر آئی تھی کہ رادھا لوٹ آئی۔ بالکل لٹی پٹی۔ ٹوٹی ہوئی،

بکھری ہوئی۔ اپنے آپ سے غافل۔ زمانے سے بے خبر۔ گھر والوں نے دیکھا تو چھاتی پیٹ لی۔

اس تیز طوفان میں ایک تیز پتے نے ایک برگِ سبز کو پناہ دی تھی۔ مریم نے رادھا کو اپنے آنچل میں چھپانا چاہا تھا مگر سیاہیوں کے سناٹے میں مریم کو مریم ہونے کی سزا ملی اور وہ اپنے محدود مرکز سے ہمیشہ کے لئے الگ کر دی گئی۔ لیکن رادھا بھی اس کی لپیٹ میں آ گئی۔ رادھا اس اعلان کے باوجود کہ وہ رادھا تھی، بچ نہ سکی۔

طوفان جب اٹھتا ہے تو وہ یہ نہیں دیکھتا کہ اسکی راہ میں کس کا گھر ہے۔

میری نگاہوں میں تکرار کے ساتھ وہ منظر رقص کر رہا ہے۔ تازہ بہے ہوئے خون کی سرخی سیاہی میں بدلتی جا رہی ہے۔ اور ہوا کے میل میں آنے سے خون جمنے لگا ہے۔ آدمی طبعی موت سے پہلے بھی کئی مرتبہ مرتا ہے۔

تعبیر کے دھندلکے

جب کوئی سکون آمیز بے قراری دل کے کسی گوشے میں ڈیرہ جمالیتی ہے تو میٹھی سی چبھن میں آدمی کا احساس جلنے لگتا ہے۔ اندر سے کوئی چیز اکساتی رہتی ہے اور ذہنی تناؤ بڑھ جاتا ہے اور جب تک اس کی خواہش تکمیل کے مرحلے سے گزر نہیں جاتی آدمی کا وجود اندھیرے اور اجالوں کے درمیان بند گھڑی کے رکے ہوئے کانٹے کی طرح لٹکا رہتا ہے۔

ایک روز چندریکا پرساد پیدل ہی کہیں جا رہے تھے۔ راستے میں ایک جگہ دیکھا سڑک کے کنارے درخت کی چھاؤں میں کئی لڑکے ایک جوتشی کو گھیرے کھڑے تھے۔ جوتشی باری باری سے ہر لڑکے کے ہاتھ کی لکیریں دیکھ کر اسے اس کی قسمت کا حال بتا رہے تھے جیسے ہی بابا کا ہاتھ خالی ہوا۔ چندریکا نے بھی اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ جوتشی نے ان کے ہاتھ کی لکیروں کو پڑھ کر بڑے غور سے ان کے سراپا کا جائزہ لیا اور بولے۔ ''آپ تو بڑے نصیب والے ہیں۔ آنے والا کل آپ کا ہوگا۔ دلی آپ کی مٹھی میں ہوگی۔''

انہوں نے بابا کی باتوں کا کوئی اثر نہیں لیا۔ ایسے تو کوئی آثار دور تک نظر نہیں آئے۔ جو بابا کی باتوں کی سچائی کا پتہ دیتے۔ اگر ان کا کہا سچ ہوا تو ان کے لئے عزت کی اس سے بڑی بات اور کیا ہوگی۔ انہوں نے چپکے سے دس کا ایک سکہ نکال کر بابا کی طرف بڑھا دیا اور اپنی راہ لی۔

لیکن جوتشی کی باتوں نے ان کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ ایک عجیب سی خواہش من میں انگڑائیاں لینے لگی۔ کہیں کچھ تو ہے ورنہ بابا اتنا کھل کر نہیں بولتے۔

چندریکا پرساد بہت دور کی سوچتے تھے۔ وقت کے مزاج کی انہیں اچھی پہچان تھی۔ سوچا کیوں نہیں کمرے کی کھڑکیاں کھول کر باہر کی تازہ ہوا اندر لے آئے۔ تاکہ اندھیرے میں بھی زندگی کا اجالا اپنی جگہ برقرار رہے۔

زندگی میں کل کبھی نہیں آتا آج گزرا ہوا کل بن جائے گا۔ لیکن آنے والے کل کی صورت آج

جیسی نہیں ہوگی ۔ ڈھلتی عمر کا تقاضا ہے کہ اب اور دیر نہ کی جائے ۔ انہیں اچھے دنوں کی جو بشارت ملی ہے ۔ وہ اسے سچ کر دکھائیں گے چاہے راہ میں جتنی بھی دشواریاں آئیں ۔ لاکھ مشکلات کا سامنا کرنا پڑے ۔ انہیں تو چلتے رہنا ہے ۔ چلنا ہی زندگی کی علامت ہے ۔

چندریکا پرساد بھی جوڑ توڑ کی سیاست کے بڑے ماہر مانے جاتے تھے ۔ ایوان کے اندر بھی ان کی آواز توجہ سے سنی جاتی تھی اور باہر بھی لوگ انہیں قدر کی نگاہوں سے دیکھتے تھے ۔ کھادی کے سفید لمبے کرتے پر آسمانی رنگ کا جیکٹ اور دھلی دھلائی دھوتی میں ان کی شخصیت کا جادو سرچڑھ کر بولتا تھا ۔ سادہ مزاج ، نرم فطرت اور چہرے پر سنجیدگی ۔ منھ کھولتے تو لوگ ان کی باتوں کی سحر میں کھو سے جاتے ۔ لمبا قد گیہواں رنگ ، ہلکی داڑھی ، لمبی ناک کے سہارے آنکھوں پر ٹکی عینک ۔ جس سے آنکھوں کی ساحرانہ چمک جھانکتی تھی ۔

لیکن اب ان میں وہ جوش جذبہ نہیں رہا تھا ۔ پھر بھی حوصلہ نہیں ہارے تھے اور کس طرح اپنی ذہنی قلاشی کا بھید بھی چھپائے ہوئے تھے ۔

چندریکا پرساد کے دل میں کھدبدی سی لگی تھی ۔ وہ اس جوتشی سے ملکران کی پیشن گوئی کا راز جاننے کو بے تاب تھے ۔ جنہوں نے ان کے اندر امید کی ایک کرن جگائی تھی ۔ لیکن ڈھونڈنے کے باوجود وہ انہیں کہیں نظر نہیں آئے ۔

تبھی انہیں دلی میں کسی بڑے جوتشی کے ہونے کی خبر ملی ۔ وہ ان سے ملنے کو بے قرار ہو گئے ۔ شاید وہ اس معمے کا کوئی ایسا حل نکال دیں ۔ جس سے ان کی حسرت پوری ہو جائے ۔

جوتشی مہاراج پرانی بستی کے ایک عالیشان آشرم میں ٹھہرے ہوئے تھے ۔ بڑے پہنچے ہوئے جوتشی تھے ۔ اندر باہر کا سب حال جانتے تھے ۔ ہاتھ کی لکیروں کو دیکھ کر آدمی کی قسمت کا حال بتا دیتے ۔ چہرہ پڑھ کر کسی کے ماضی اور حال کو کھنگالنا ان کے لئے کوئی بڑی بات نہیں تھی ۔ زبان میں ایسی تاثیر کہ جو بات منھ سے نکل گئی پتھر کی لکیر ۔ کیا مجال کہ ذرا بھی ٹس سے مس ہو جائے ۔

لیکن کسی نے ان کے خلاف یہ افواہ اڑا رکھی تھی کہ بابا کے قبضے میں کوئی موکل ہے جسے انہوں نے عمل کے ذریعہ حاصل کیا ہے ۔ اور موکل تو آدمی کے رگ وپے میں سما کر اس کے دل کی ہر بات

جان لیتا ہے۔

چندر یکا نے یہ سوچ کر ان افواہوں پر کوئی توجہ نہیں دی کہ اچھے آدمیوں کے خلاف تو اس طرح کے قصے ہمیشہ گڑھے جاتے رہے ہیں۔

جوتشی مہاراج کے لئے دلی نئی جگہ تھی لیکن ان کی شخصیت کا جادو لوگوں پر ایسا چلا کہ جلد ہی دلی والے ان کے گرویدہ ہو گئے اور اپنی ہر آس ان کی ذات سے باندھ لی اور وہ لوگوں کی ہمدردیاں بٹور کر ان کے دلوں پر راج کرنے لگے۔

دور دور سے لوگ ان کی قدم بوسی کو آنے لگے۔ ان کے چرنوں کی دھول سے لوگوں کی بگڑی بننے لگی۔ سیاسی اور سماجی خدمتگاروں کا ایک جمگھٹا سا ہر وقت رہنے لگا ان کے ساتھ کسی کو ان کی جھولی میں اپنے پیار کی تلاش رہی تو کوئی اس میں اپنے غموں کا مداوا ڈھونڈنے لگا۔ ان کے فیض کے دریا میں ڈبکی لگا کر سیاسی بازیگروں کے لئے بازی جیتنا آسان ہو گیا۔ بابا اپنی ذات سے لو لگانے والوں پر خوشیاں نچھاور کرتے رہے۔ لوگوں کی پریشانیاں دور کر کے انہیں عزت شہرت اور بے پناہ دولت حاصل ہو گئی اور انہوں نے شہر کے قلب میں ایک شاندار فلیٹ خرید لیا۔ کہیں آنے جانے کے لئے ہر وقت دروازے پر ایک کار کھڑی رہنے لگی۔ ضرورت مندوں کو دان دینے کا سلسلہ چلا تو کتنوں کی مرادیں بر آئیں۔ کتنے ادارے ان کی فیاضی کے گیت گنگنانے لگے۔ انہوں نے خود کو سیاست سے الگ رکھا۔ لیکن سیاسی بازیگروں کی نکیل اپنے ہاتھ میں رکھی۔

ماضی اپنا ہے اور حال پر کسی اور کی گرفت۔ ماضی جو یادوں کے سوا کچھ نہیں دیتا۔ لیکن مستقبل کے اجالے کی سوغات تو جوتشی مہاراج کی مرضی سے بنٹ رہی تھی۔

اور ایک روز نصیب سے چندریکا پرساد کو بابا کے دربار میں باریابی کا شرف حاصل ہو گیا۔ وہ اپنی پارٹی کے کسی کام سے دلی آئے ہوئے تھے۔ موقع ملتے ہی ایک روز اپنی قسمت آزما کر دل کی خلش مٹانے بابا کے دربار میں پہنچ گئے۔

اتفاق سے جوتشی مہاراج اپنی بیٹھک میں تنہا تھے۔ وہ چپ چاپ سر جھکائے ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ بابا نے ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ان پر ڈالی اور کہا۔

’’تم اتنے اداس کیوں ہو چندریکا۔تمہارے ماتھے پر تو آنے والے کل کا وزیر اعظم ہونا لکھا ہے۔!‘‘

’’سچ مہاراج؟‘‘ چندریکا نے خوش ہو کر بابا کے قدم چوم لئے۔

’’ہاں۔لیکن‘‘ بابا بولتے بولتے رکے۔

’’بولئے بابا۔بولئے۔میں آپ کا ہر حکم فرض سمجھ کر پورا کرونگا۔‘‘

’’کام ذرا کھٹن ہے۔اس کے لئے تمہیں سخت محنت کرنی ہوگی۔دیش کی پد یاترا کا دکھ جھیلنا ہوگا۔تا کہ نزدیک سے تم لوگوں کے حالات زندگی کا جائزہ لے سکو۔ان کی ضرورتوں کو سمجھنے اور ان کی مشکلات کا حل ڈھونڈنے کے لئے ایسا کرنا ضروری ہے۔زمانے کا دکھ درد بانٹ کر تمہیں جو ہمدردیاں حاصل ہونگی وہ تمہارے بہت کام آئینگی۔لوٹ کر آؤ گے تو وزارت عظمٰی کی کرسی تمہارا انتظار کر رہی ہوگی۔‘‘

تب ہی چندریکا پرساد نے پد یاترا کا فیصلہ کرلیا۔اور ایک لمبے سفر کی تیاری میں جٹ گئے۔ دوست احباب اور گاؤں سماج والوں نے بھی خوب ساتھ دیا۔زادراہ کے لئے اتنے پیسے اکٹھا ہو گئے کہ پد یاترا آسان ہوگئی۔پھول مالاؤں سے لاد کر لوگ انہیں علاقے کی سرحدوں تک چھوڑ آئے۔

چندریکا پرساد کی پد یاترا کی خبر تو پہلے ہی لوگوں کو ہو چکی تھی۔پھر تو وہ جہاں بھی گئے لوگوں نے بڑھ چڑھ کر استقبال کیا۔کہیں سڑکوں کو رنگ برنگی جھنڈیوں سے سجایا گیا۔کہیں گیٹ اور استقبالیہ محرابیں لگائی گئیں۔وہ جہاں جس مقام پر ٹھہرے ان کی آمد کی خبر جس نے سنی وہی دوڑا چلا آیا۔دیکھنے کی حسرت اور سننے کا شوق ان کے ہر جلسے اور نکڑ سبھاؤں میں لوگوں کی بھیڑ نظر آنے لگی۔وہ جدھر سے گزرے قطار در قطار کھڑے لوگوں نے ہاتھ ہلا اور جھنڈیاں لہرا کر انہیں خوش آمدید کہا۔جہاں ان کی پارٹی کی حکومت تھی وہاں انہیں سکوں سے تولایا گیا۔اور جہاں ان کی ذات برادری کے لوگوں کی اکثریت رہی۔وہاں لاکھوں روپے انہیں نذرانے میں ملے۔سیر و سیاست کے دلدادہ جہاں جس علاقے میں گئے وہیں کے رنگوں میں رنگ کر سب کا من موہ لیا۔اپنوں سے ملے تو دل کی باتیں کیں اور نوجوانوں کے درمیان اپنی اچھی ساکھ قائم کرلی۔غیروں کے یہاں قیام کیا تو ان کی آنکھوں میں سنہرے سپنے سجائے۔غریب مزدور اور ضعیفوں کے درمیان دھوتی اور ساڑی بانٹ کر ان کے دلوں میں اپنے لئے جگہ بنائی۔

ان کا اخباروں میں نام خوب اچھالا گیا۔تعریفوں کے پل باندھے گئے۔ریڈیو پر ان

کے پروگرام کی جانکاری دی گئی۔ ٹیلی ویژن کے پردوں پر صحافیوں سے روبرو ہوئے۔ جگہ جگہ ان کے لئے پریس کانفرنس کا اہتمام کیا گیا۔ پریس فوٹو گرافر نے قدم قدم پر ان کے فوٹو اتارے۔ اور وہ ہر جگہ ہر مقام پر لوگوں کے درمیان اپنی مسکراہٹیں نچھاور کرتے رہے۔ آدمی بڑے جہاندیدہ تھے۔ دوسروں کے کام آنا جانتے تھے۔ ان کی انسان دوستی ان کے بہت کام آئی اور سفر بنا کسی جوڑ توڑ کے جاری رہا۔

وہ شہر شہر، قریہ قریہ، گاؤں کے گلی کوچے اور دھول بھری سڑکوں سے گزرتے رہے۔ جنگلوں اور بیابانوں کی خاک چھانتے پاؤں میں چھالے پڑ گئے لیکن ہمت نہیں ہاری۔ دل میں پنپ رہی خواہش نے انہیں سہارا دے رکھا تھا۔

برسوں بعد جب واپسی کا پروگرام بنا تو انہیں اپنے لئے دلی کی راج گدی تک پہنچنے کا راستہ ہموار نظر آرہا تھا۔ مسلسل سفر اور بدلتے موسموں کی سرد و گرم ہواؤں نے انھیں تھکا ضرور دیا تھا لیکن گھر لوٹ کر جب لوگوں کے چہرے پر اپنے استقبال کی بے پناہ گرم جوشی دیکھی تو وہ خود کو بھی تازہ دم محسوس کرنے لگے۔

کئی روز تک چندریکا پرساد کی بیٹھک میں لوگوں کی بھیڑ لگی رہی۔ ان کی پارٹی کے رہنما بھی لاؤ لشکر کے ساتھ آئے۔ اور گاؤں سماج کے علاوہ مخالف جماعتوں کی نمائندہ شخصیتیں بھی آئیں۔ وہ سب کو اپنے سفر کی روداد سناتے رہے۔ لوگ خوشیوں بھرے ماحول میں ناشتے اور چائے کا مزہ لیتے ہوئے بڑی دلچسپی کے ساتھ ان کی باتیں سنتے رہے۔

پھر ایک روز۔ انہوں نے وہ تمام اخبار اور رسائل اکٹھا کئے۔ جن مین ان کی پدیاترا کی خبریں اور تصاویر شائع ہوئی تھیں۔ جنہیں ان کے ایک عزیز شاگرد نے نہایت سلیقے سے سجا سنوار کر کتابی شکل دی اور ان یادگار لمحوں کو ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا۔

اب چندریکا پرساد کے لئے دلی دور نہیں رہی تھی۔

اور ایک صبح چندریکا پرساد نے جوتشی مہاراج سے ملنے کا پروگرام بنالیا۔ ڈرائیور نے پہلے سے ہی کار دروازے پر لگا رکھی تھی۔ وہ آرام سے کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے تو ڈرائیور نے گاڑی بڑھا دی۔ کچھ ہی دیر بعد جب گاڑی منزل کے قریب آئی تو انہوں نے کچھ دور ہی سڑک کے کنارے کار رکوا دی اور

خود پیدل چلتے ہوئے بابا کے دروازے تک جا پہنچے۔

تبھی ایک ہاکر۔ ہاتھوں میں تازہ اخبار کا ایک بنڈل تھامے اس کی اہم سرخیاں چلاتا ہوا سامنے سے گزر گیا۔

آج کی تازہ خبر...... کئی قتل اور دھوکہ دھڑی کا فراری ملزم شیام آنند مہاراج گرفتار۔ سات دنوں کی ریمانڈ پر پولس حراست میں......!

افسانہ نگار

زیبا ہاتھ دھو کر رسوئی سے نکلی تو فراز آفس جانے کے لئے تیار کھڑا تھا۔ وہ اسے چھوڑنے دروازے تک آئی۔ مگر نہ جانے کیوں آج فراز کے چہرے کی اداسی اس کے من کو بھی اداس کر گئی۔ فراز نے جاتے ہوئے نہ تو اس سے کچھ کہا اور نہ ہی مسکراہٹوں کے پھول اس پر نچھاور کئے۔ بس دھیرے سے اپنے من پر بڑھتے بوجھ کو سمیٹے دروازے سے نکلا اور پھاٹک کھول کر سڑک کی بھیڑ میں گم ہو گیا۔

آج شاید پہلی بار ایسا ہوا تھا۔

زیبا کواڑ پکڑے دیر تک یوں ہی کھڑی رہی۔ انجانی سوچ میں غرق۔ مسرت آگئیں لمحات میں گم۔ فراز کی شوخیاں اسے چھیڑنے لگیں۔ اس کی میٹھی شرارت سے زیبا کا من گدگدا اٹھا۔

وہ جب بھی اسے چھوڑنے راہداری میں آتی فراز اسے چھیڑنا نہیں بھولتا۔ کبھی کوئی طنزیہ شعر سنا کر اس کی ہنسی اڑاتا، کبھی آنکھوں میں پیار کی کوئی کہانی رکھ کر چل دیتا۔ زیبا منھ بسور کر رہ جاتی۔

"تمہیں تو کچھ لگتا ہی نہیں۔ سامنے دروازہ کھلا ہے۔ کسی نے دیکھ لیا تو۔؟"

مگر وہ تو اس کی چاہت میں ایسا شرابور تھا کہ اسے صرف زیبا یاد رہ گئی تھی۔ زیبا کا پیار اسے دنیا و مافیہا سے بے خبر بنائے ہوئے تھا۔۔ اس کی مسکراہٹ اسے تازگی عطا کرتی اور اس کے بدن کی خوشبو کا لمس اسکے وجود کی ساری تھکن دور کر دیتا۔

اگر کسی روز وہ زیبا سے ملے بغیر چلا گیا تو دن بھر زیبا کا خیال اس کے ذہن کو ڈستا رہتا۔ طبیعت اچاٹ اچاٹ سی رہتی اور آفس سے لوٹتے ہی زیبا کو چھیڑتا۔

"دیکھو زیبا آج تم نے پیار نہیں دیا تو مجھے آفس میں کتنی جھڑکیاں کھانی پڑیں۔!"

"سچ۔!" زیبا کے کانوں میں گھنٹیاں سی بج اٹھتیں۔ وہ اس انداز سے مسکرا کر اس کی طرف دیکھتی کہ فراز لاجواب ہو جاتا اور زیبا رسوئی میں گھس جاتی۔ جب تک فراز کپڑے بدل کر ہاتھ منھ دھوتا۔

زیبا میز پر ناشتے کی پلیٹیں سجا دیتی۔ دونوں ساتھ بیٹھے گرم گرم سموسے اور پکوڑیاں کھاتے۔ پھر چائے کا مزہ لیتے۔

زیبا نے یکبارگی خیالوں کو جھٹک کر دروازہ بند کیا اور ہاتھوں سے بال سمیٹتی ہوئی قد آدم آئینے کے سامنے جا بیٹھی اور اپنے سراپا کا جائزہ لینے لگی۔ آج اس نے بہت دھیان سے اپنی صورت دیکھی تھی۔ چہرہ کیسا پھیکا پھیکا لگ رہا تھا۔ کل سے ساڑی بھی نہیں بدلی تھی اور بال بھی ڈھنگ سے سنوارے ہوئے نہیں تھے۔ وہ تو گھر کے کاموں میں اتنا مصروف رہتی تھی کہ اسے اپنی اور دیکھنے کا موقع ہی نہیں ملتا تھا۔ پھر بھی زیبا اس کے ساتھ خوش اور مطمئن تھی۔ اس نے فراز کے دکھ بانٹ کر اپنی تمام خوشیاں اسے دے دی تھیں۔ وہ گھر کے سارے کام خود کرتی۔ کپڑے دھونا، کھانا بنانا اور بچوں کی دیکھ بھال کے ساتھ فراز کے کپڑے بھی اسے ہی استری کرنے پڑتے تھے۔

فراز بھی اس کا بہت دھیان رکھتا۔ کبھی اپنی اور سے بے اعتنائی نہیں برتی۔ اکثر شام کو دونوں ایک ساتھ گھومنے نکلتے۔ کبھی بازار، کبھی سنیما ہال میں بیٹھ کر من پسند فلم دیکھتے مگر چھٹی کا سارا دن فراز گھر کے کام کاج میں اس کا ہاتھ بٹاتے گزارتا۔ بعض اوقات زیبا اسے جھڑک دیتی۔ ابھی تو تھک کر آئے ہو۔ تھوڑی دیر تو آرام کر لیا کرو۔ رات کو کتابیں پڑھو گے اور دیر تک کہانیاں لکھو گے۔ ٹھیک سے سونا بھی نصیب نہیں ہوتا۔ دیکھتے نہیں صحت کیسی گرتی جا رہی ہے۔

حالانکہ وہ خود کتنا بدل گئی تھی۔ آنکھوں میں اداسی اور پیشانی پر تھکن کے آثار اپنا رنگ جمانے لگے تھے اور چہرے کی رنگت بھی ماند پڑتی جا رہی تھی۔

جب فراز کے ساتھ اس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ تب فراز کو کالج میں پڑھتے ہوئے کہانی لکھنے کا شوق ہو گیا تھا۔ کہانی سننے سنانے کا شوق تو اسے لڑکپن سے تھا۔ لیکن پڑھتے پڑھتے کہانی لکھنا بھی آ گیا۔ اور اس کے اس شوق کو جلا بخشی اس کے کالج کے ہی ادب کے ایک استاد نے جنہوں نے اس کے اندر چھپے فنکار کو پہچان کر اس کی صلاحیتوں کو مزید نکھارنے کا من بنا لیا اور اس کی رہنمائی بھی کرنے لگی۔ اسے افسانہ نویسی کے گر سکھائے۔ آداب فن اور اسکے رموز سے واقف کرایا۔

فراز کی دیرینہ حسرت پوری ہوئی۔ اس کی کہانیاں جب اخباروں اور رسالوں میں اہتمام سے

چھپنے لگیں تو اس کی امنگوں کو جیسے پر لگ گئے اور جلد ہی اس نے دنیائے ادب میں ایک معتبر افسانہ نگار کی حیثیت سے اپنی پہچان بنالی اور دن بدن اس کے مداحوں کا حلقہ وسیع ہوتا گیا۔

ذیبا کے گھرانے میں بھی ادب کی بو باس پہلے سے تھی۔ جب وہ اسکول میں پڑھتی تھی تو روزانہ اس کے یہاں ایک اردو اخبار آتا تھا۔ اور کبھی کبھار وہ بک اسٹال سے بھی کوئی جریدہ خرید کر لے آتی تھی۔ رفتہ رفتہ اس کی یہ دلچسپی ایک عادت سی بن گئی فراز اس کا من پسند کہانی کار تھا۔ وہ اس کی کہانیاں بڑے شوق سے پڑھتی تھی۔

ایک روز اس کے پاس پڑھنے کو کچھ نہیں تھا۔ عادت ستانے لگی تو وہ بھیا کی میز پر سے ایک تازہ میگزین اٹھالائی جس میں کہانی کے ساتھ فراز کی تصویر بھی شائع ہوئی تھی۔ وہ حیرت میں پڑ گئی۔ تصویر اسے کچھ جانی پہنچانی سی لگی۔ ذہن پر بہت زور دیا مگر اسے کچھ یاد نہیں آیا کہ اس نے اسے کب اور کہاں دیکھا ہے۔ تب بھیا نے اس کی مشکل آسان کر دی اور اسے فراز کے متعلق سب کچھ بتا دیا۔

جس فراز کو وہ ایک بڑا کہانی کار سمجھ رہی تھی۔ وہ تو اس کے بھیا کا بہت قریبی دوست نکلا۔ جسے وہ اپنے یہاں پہلے بھی دیکھ چکی تھی اور کئی بار اس سے باتیں کرنے کا موقع بھی ملا تھا۔ مگر تب ایسا تو کچھ بھی نہیں تھا۔ لیکن جب سے وہ اس کے اندر کے چھپے فنکار سے ملی تھی۔ فراز نے اس کے دل میں اپنے لئے پیار جگا دیا تھا۔ وہ اس کی ذات میں دلچسپی لینے لگی تھی۔

پھر تو جب بھی کوئی کہانی چھپ کر آتی۔ فراز اسے پڑھنے کو ضرور دیتا اور اس سے مشورے بھی طلب کرتا۔ کہانیوں پر زیبا کی رائے بڑی معقول ہوتی۔ جلد ہی فراز کو اس بات کا اندازہ ہو گیا کہ زیبا کی نظر کہانیوں پر بڑی گہری ہے۔ کسی کہانی کو ایک بار پڑھ کر وہ بتا سکتی ہے کہ کہانی کس مزاج کی ہے۔ اس کا معیار کیسا ہے۔ کہاں کون سی کمزوری رہ گئی۔ اسے اپنی کہانیوں پر زیبا کی بے لاگ تنقید بہت اچھی لگتی۔ وہ اس کی ذہانت اور فنی بصیرت کا قائل ہو گیا۔

دوستی بڑھتی گئی۔ دونوں گھروں سے نکل کر ہوٹلوں اور پارکوں میں ایک دوسرے سے ملنے لگے۔ کبھی ندی کنارے ٹیلے پر بیٹھ کر ڈوبتے سورج کا نظارہ کرتے اور کبھی خاموش اور پرسکون راہوں پر چلتے ہوئے اتنی دور نکل جاتے کہ کچھ دھیان ہی نہیں رہتا۔ جب گھروں کو لوٹتے تب دوری کا احساس ہوتا۔

جب دونوں کے اندر کا پیار مچل کر ہونٹوں پر آنے لگا تو ایک روز فراز نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اسے خود کے لئے مانگ لیا۔

''زیبا تمہیں میری کہانیاں بہت پسند ہیں نا۔؟''

''ہاں۔تمہاری کہانیوں میں تو مجھے اپنے دل کی دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں!''

''میں بڑا خوش نصیب ہوں زیبا کہ مجھے تم جیسا ادبی ذوق رکھنے والی ایک قدرداں ملی۔تم میری بن جاؤ تو میں تمہیں پاس بٹھا کر روز ایک کہانی لکھوں!''

''لیکن جانتے ہو۔کہانی اور حقیقت میں بڑا فرق ہوتا ہے!''

''ہاں زیبا۔تم نے میرے من کی بات کہہ دی۔لیکن یہ بھی سچ ہے کہ بعض اوقات کہانی حقیقت بن جاتی ہے۔اور کبھی حقیقت کو کہانی کا روپ دے دیا جاتا ہے۔لیکن دونوں کا لگاؤ ایک دوسرے سے بنا رہتا ہے۔!''

فراز کی بات اس کے من کو بھا گئی اور اس نے فراز کی کہانیوں میں زندگی کے رنگ بھرنا مان لیا۔

فراز بڑا خوش اخلاق اور بلند کردار کا لڑکا تھا۔پڑھنے میں تیز اور دیکھنے میں نہایت اسمارٹ کالج کی تعلیم کے دوران ہی اس کے کئی واقف کار اسے اپنی لڑکیوں کے لئے پسند کر چکے تھے۔لیکن فراز کے والد نے پہلے ہی اس کے لئے اپنے ایک دیرینہ دوست کی لڑکی دیکھ رکھی تھی اور وہ نازیہ کو بیاہ کر لانے کا من بنا چکے تھے۔جو اپنے باپ کی اکلوتی بیٹی تھی اور ایک بڑی جائداد کی تنہا وارث۔

لیکن فراز نے تو اپنا دل کہیں اور گروی رکھ چھوڑا تھا۔اور اس عہد و پیمان سے مکرنا اس کے بس کی بات نہیں رہی تھی۔اگر زیبا کو بیچ منجدھار میں چھوڑ کر اس نے کسی اور کا ساتھ پکڑ لیا تو اس کا ضمیر اسے کبھی معاف نہیں کرے گا۔اسے اپنے کئے کی ایسی سزا ملے گی کہ وہ پل پل مرے گا اور اسے گھٹ گھٹ کر جینا ہوگا۔

اس نے سب کی امیدوں پر پانی پھیر دیا اور والدین کی مرضی کے خلاف زیبا سے شادی کر لی۔زیبا کو اپنانے کے بعد اس کی زندگی میں کئی اتار و چڑھاؤ آئے۔والدین کی ناراضگی اور اپنوں کی بے اعتنائی نے اس کے سامنے نئی مشکلیں کھڑی کر دیں۔لیکن وہ خود دار تھا۔حوصلہ نہیں ہارا۔زندگی کی

گاڑی کو پٹری پر لانے کے لئے ایک پرائیوٹ کمپنی میں کلرک کی نوکری کرلی۔ مگر اپنوں کے آگے جھکنا منظور نہیں کیا۔

وقت کا سورج انگڑائیاں لیتا۔ کروٹیں بدلتا، ڈوبتا اور ابھرتا رہا۔ راتوں کے چاند کی چاندنی، کبھی کھیتوں میں اناج کی بالیوں سے انکھیلیاں کرتی اور کبھی جنگل جھاڑ کی اوٹ میں چھپ کر سوتی اور جاگتی رہی، دن یوں ہی گزرتے رہے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے کئی ماہ و سال بیت گئے۔ لیکن جب وقت کی گردش میں بدن جلنے لگا اور مہنگائی سر چڑھ کر بولنے لگی تو اکیلی تنخواہ کے پیسے فراز کے گزر بسر کے لئے کم پڑنے لگے۔ بچوں کی پڑھائی کا خرچ۔ منی کے لئے دودھ کے ڈبے۔ راشن کی خریداری، بجلی بل اور مکان کرایہ۔ جانے کے سو راستے اور آنے کا اکیلا دروازہ۔

تب فراز کو اپنی کہانیوں کا خیال آیا۔ کہانیاں جو پیٹ بھر روٹی تو نہیں دے سکتیں۔ لیکن نمک اور تیل تو جٹا ہی سکتی تھیں۔ اس نے قلم تھام لیا۔ اور کہانیوں کے پیچھے بھاگنے لگا۔ جتنی بے قاعدگی اس کے لکھنے میں آگئی تھی اس سے زیادہ دھیان سے وہ کہانیاں گڑھنے لگا۔ نت نئے موضوع کی دلچسپ اور اچھوتی کہانیاں۔ جب اس کے ذہن میں کلبلانے لگیں تو وہ انہیں صفحۂ قرطاس پر بکھیر کر ہی دم لیتا۔

حالانکہ اسے اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ یہ دنیائے ادب بڑی بے حسوں کی دنیا ہے۔ یہاں کوئی کسی کو نہیں پوچھتا۔ فنکار کے اندر کی قابلیت ہی اسے اونچا بناتی ہے۔ لیکن کہانیاں تو زندگی کے مسئلے کا حل نہیں۔ معاوضہ کے نام پر ادیبوں کو ملتا ہی کیا ہے۔ چند تعریفی کلمات اور نام کمانے کی ایک بے نام سی خواہش کے سوا۔ البتہ سرکاری رسالوں میں چھپنے سے کہانی کے دو چار سو ضرور مل جاتے ہیں مگر بعض مدیر تو ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنے قلمکاروں کے خطوط کا جواب تک نہیں دیتے لیکن اپنی اردو دوستی اور ادب نوازی کا ڈھنڈورا پیٹتے ہوئے نہیں تھکتے۔

محنت کا اثر فراز کی صحت پر بھی پڑا۔ بال سفید ہونے لگے۔ آنکھوں پر عینک چڑھ گئی۔ مگر زیبا کی خوشی اسے ہر حال میں مقدم تھی۔ وہ اسے بے ترتیب دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ اپنے آپ سے زیبا کی یہ لاپرواہی اسے کھل گئی۔

صبح جب اسے آفس جانے میں دیر ہو رہی تھی۔ جلدی جلدی اسے نے الماری سے کپڑے

نکالے۔اس کی قمیض کا ایک بٹن ٹوٹا ہوا تھا۔وہ اسے لے کر زیبا کے پاس گیا۔زیبا رسوئی میں بیٹھی کھانا پروس رہی تھی۔

''دیکھو زیبا۔مجھے دیر ہو رہی ہے۔جلدی سے تم یہ بٹن ٹانک دو۔!''

''تم کھاؤ۔میں ٹانکے دیتی ہوں۔!''

زیبا نے کھانا نکال کر اس کے سامنے ٹیبل پر رکھ دیا اور اس کی قمیض میں بٹن ٹانکنے لگی۔

چند لقمے کھا کر اس نے زیبا کی طرف دیکھا۔زیبا کا بے رنگ اور بجھا بجھا سا چہرہ دیکھ کر اس کے من کو بڑی ٹھیس لگی۔اس نے پوچھا۔

''زیبا تم نے یہ کیا صورت بنا رکھی ہے؟''

وہ اس کا کیا جواب دیتی۔اسے یہ کیوں کر بتاتی کہ صبح سے اب تک وہ دو بار منی کے کپڑے بدل چکی ہے۔منا کو اسکول پہنچا کر رسوئی میں آٹا گوندھنے بیٹھی تھی۔روٹی بنا کر اٹھی تو اس نے اسے پکار لیا۔زیبا جب قمیض میں بٹن ٹانک کر اٹھی تو فراز کھانا کھا چکا تھا۔وہ جوٹھے برتن نل کے پاس رکھ کر اسے چھوڑنے اس کے پیچھے راہداری میں آ گئی۔مگر فراز نے حسب معمول نہ تو اسے چھیڑا اور نہ ہی اس سے کوئی بات کی۔بس گزرے پل کی ساری کڑواہٹ من میں سمیٹے آفس کے لئے گھر سے نکل گیا۔اپنے پیچھے یادوں کی بے شمار کرچیاں چھوڑے جو پھانس بن کر زیبا کے سینے میں اٹک رہی تھیں۔اس کی بے نیازی زیبا کی انا کو تڑپا گئی۔اسے تو دم مارنے کی مہلت بھی نہیں ملتی۔خود کو بنانے اور سنوارنے کا وقت کہاں سے نکالتی۔اپنی کھیس مٹانے کے لئے اس نے سوچا اور آئینے کے پاس سے ہٹ آئی۔

آج اس کے اندر جو لاوا اُمڈ کے پھوٹ پڑا تھا۔خوب روئی،دل کا بوجھ ذرا ہلکا ہوا تو پھر آئینہ کے پاس جا بیٹھی۔ہونٹوں پر لپ اسٹک کی تہ جمائی،گالوں پر غازہ ملا،بال سنوار کر آئینہ کے پاس سے اٹھی تو چہرہ دیکھ کر خود ہی شرما گئی۔

فراز آفس سے لوٹا تو گھر میں قدم رکھتے ہی زیبا کو ٹوک دیا۔

''اتنا بن ٹھن کر کہاں جا رہی ہو؟''

زیبا چکرا کر رہ گئی۔اسے اپنی بے بسی سے زیادہ فراز کی ناسمجھی پر غصہ آ گیا۔

''کہیں نہیں۔!''

''تو پھر یہ بناؤ سنگھار کیسا کہ دیکھ کر ہی آدمی کے قدم بہک جائیں؟''

فراز کا سوال اسے بڑا عجب سا لگا۔ غصے اور خجالت کو مٹانے کی غرض سے وہ ہنس پڑی اور بات بدلتے ہوئے بولی۔

''آج کی ڈاک دیکھ کر اندازہ ہوا کہ تمہاری کہانیوں کی مانگ بہت ہے۔ اور تم اپنی پسند کے ان رسالوں کو بھی کہانیاں نہیں بھیج پا رہے ہو جن کے مدیروں سے تمہارے تعلقات اچھے اور دوستانہ مراسم ہیں تو یاد آیا کہ تم نے کئی دنوں سے کوئی کہانی نہیں لکھی ہے اور کئی ادھوری کہانیاں بھی پڑی ہیں۔ تو سوچا آج سامنے بیٹھ کر انہیں ضرور پورا کراؤں گی!''

''سچ زیبا۔؟'' خوشیوں سے فراز کا چہرہ کھل اٹھا۔

''ہاں دیکھو۔ جس رسالے میں تمہاری کہانی ''افسانہ نگار'' چھپی ہے۔ پبلشر نے معاوضے کے طور پر اس کے پورے پانچ سو روپے بھجوائے ہیں۔ میں نے کہا تھا نا کہ تمہاری یہ کہانی بہت دم دار ہے۔ چھپتے ہی تمہاری قابلیت کا لوہا منوا لے گی!''

''اسی لئے تو میں نے تمہارے اس انداز فکر کی ہمیشہ تعریف کی ہے۔ زیبا تمہارا یہ پیار ہی تو ہے جو میرے جینے کا سہارا ہے!''

''اور سنو۔ قارئین کی پسندیدگی کے یہ ڈھیر سارے خطوط بھی آئے ہیں جو اس بات کے گواہ ہیں کہ تم ایک بڑے کہانی کار ہو۔ اور تمہیں اپنا جیون کھویا بنا کر میں نے کوئی غلطی نہیں کی ہے۔!

''واقعی تم کتنی اچھی ہو زیبا!'' فراز نے بڑے پیار سے اس کی طرف دیکھا اور زیبا کے سارے وجود میں خوشی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔

''میرا موازنہ۔ تم اپنی کہانیوں کے کسی کردار سے مت کرو۔''

''یہ بات نہیں زیبا۔ سچ کہہ رہا ہوں۔ آج مجھے تم پہلے سے بھی زیادہ حسین لگ رہی ہو۔!''

''ڈرتی ہوں۔ مجھ میں کھو کر۔ کہیں تم کہانی لکھنا نہ بھول جاؤ!

''تمہیں دیکھ کر تو مجھے کہانی یاد آنے لگتی ہے زیبا۔ اگر تم یوں ہی سامنے بیٹھی رہو۔ تو میں ساری

عمر کہانی لکھتا رہوں!''

برسوں بعد آج زیبا اصل روپ میں اس کے سامنے آئی تھی۔ اسے اپنی خوشیوں پر اختیار نہیں رہا۔ اور اسی بے خودی میں اس نے زیبا کا چہرہ اپنے ہاتھوں کے کٹورے میں بھر کر اوپر اٹھالیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ دیں۔

خود کو چھڑانے کی کوشش میں زیبا کے ہاتھوں کی چوڑیاں بج اٹھیں۔ اور چوڑیوں کی یہ کھنک دیر تک ان کے کانوں میں رس گھولتی رہی۔

سُپاری

وقت نے ایسا شب خوں مارا کہ میری زندگی اجڑ کر رہ گئی۔

میں نے یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ زندگی میں ایسا بھی لمحہ آئے گا جب تم پرائی بن کر مجھے تڑپانے کے لئے اپنی یادیں میرے پاس چھوڑ جاؤ گی۔

تمہارا رشتہ کب اور کیسے طے پایا۔ نہ مجھے اس کی بھنک ملی اور نہ کچھ سمجھ میں آیا۔ لیکن میرے سمجھنے اور نہیں سمجھنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ حقیقت پر پردہ ڈالنے سے سچائی تو نہیں بدل جاتی۔

بات بڑی تکلیف دہ تھی۔ دل میں درد کی ایک لہر سی اٹھی اور سارے وجود کو دکھوں کی آماجگاہ بنا گئی۔ ذہن میں شرارے سے ناچنے لگے۔ تم میری تھیں۔ میں نے تمہیں چاہا تھا۔ تمہیں پانے کی تمنا کی تھی۔ میری سانسوں میں بس کر تم نے دل پر اپنا قبضہ جما لیا تھا۔ اگر تم میری نہ بن پائیں تو میں جی کر کیا کرونگا۔ میں نے سوچا۔ بہت سوچا۔ سوچتے سوچتے بدن جلنے لگا۔ ایک نامعلوم سی آگ میں۔ مگر دوریاں پاٹنے کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی اور فاصلے تھے کہ بڑھتے جا رہے تھے۔ میں بے موت مرنا نہیں چاہتا۔ مجھ سے میری رسوائی برداشت نہیں ہوگی۔ ذلت آمیز زندگی جینا مجھے پسند نہیں۔

جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا ہے۔ ویسے ویسے میری الجھنیں بڑھتی جا رہی ہیں۔ کبھی میں جنگلہ تھامے نامعلوم سوچوں میں غرق باہر پھیلے اندھیروں کو تکتا رہتا ہوں۔ کبھی بے مقصد سڑکوں پر گھومتے ہوئے اپنی روٹھی زندگی کو منانے کی تدبیریں سوچا کرتا کہ شاید ہاری ہوئی بازی جیتنے کی کوئی صورت نکل آئے۔ مگر تم تو والدین کی مرضی کے آگے سپر ڈال چکی ہو۔ اور تمہیں بھولنا میرے لئے ممکن نہیں رہا۔ تم میرے ہوش و حواس پر اس طرح چھائی ہو کہ مجھے تمہارے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ جدھر دیکھتا ہوں تم کھڑی ملتی ہو۔ کہیں تنہا کمرے میں بیٹھی میرے سامنے اپنا سبق دہرا رہی ہوتی ہو۔ کہیں عروسی جوڑے میں ملبوس ایک اجنبی کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے گھر سے رخصت ہو رہی ہوتی ہو۔ تم جتنی ذہین تھیں۔ اتنا ہی نرم

مزاج تھا تمہارا۔ خوبصورتی تمہارے انگ انگ سے ٹپکتی تھی۔ لوگ تمہارے حسن کی داد دیا کرتے تھے۔ تم نویں کلاس میں تھیں تب سے ہی میں نے تمہارے پڑھانے کی ذمے داری سنبھال رکھی تھی۔ میں تمہاری ذہانت کا قائل تھا۔ مگر تمہارے بھائی پرشانت میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ جس طرح پھولوں کی حفاظت کے لئے کانٹے ہوتے ہیں۔ شاید اسی خیال سے ماں نے بھی اپنے دل میں چھپے چور پر نظر رکھنے کے لئے پرشانت کو تمہارے ساتھ لگا دیا تھا۔ جسے پڑھاتے ہوئے مجھے بڑی کوفت ہوتی تھی۔ تم نے بہت سے شعر یاد کر رکھے تھے۔ جب بھی تمہیں کسی شعر کا مطلب پوچھنا ہوتا اور تم وہ شعر گنگناتیں تو میرے سامنے جل ترنگ سے بج اٹھتے۔ دور دور تک عشق کی ایک داستان سی بکھر جاتی اور میں پیار و محبت کی دنیا میں اس طرح کھو جاتا کہ میری آنکھیں تمہاری محبت کا دم بھرنے لگتیں اور جی چاہتا کہ تم بھی مجھ سے اسی طرح ملو۔ مسکرا کر میری طرف دیکھو۔ کھل کر پیار کی باتیں کرو۔ جس طرح میں تمہیں عشق و محبت میں ڈوبی ہوئی رنگین کہانیاں سناتا ہوں۔ مگر یہ ماحول کا اثر تھا یا تمہارا لاابالی پن کہ سب کچھ جاننے اور سمجھتے ہوئے بھی تم ان باتوں سے لاتعلق بنی رہیں۔ صرف اپنی پڑھائی سے مطلب رکھا۔ پیار و محبت کے بکھیڑوں سے الگ ٹیچر اور شاگرد کے درمیان اپنائیت کا جو رشتہ ہوتا ہے۔ تم نے اس کے تقدس کو کبھی پامال ہونے نہیں دیا۔

تمہارا لڑکپن میرے سامنے گزرا تھا اور تم پر جوانی کی کئی بہاریں بھی اترتے میں نے دیکھیں تھیں۔ مگر میری نظروں میں تو تم اب بھی وہی نویں کلاس جیسی چودہ سالہ الھڑ لڑکی تھیں۔ جسے دیکھ کر میں تمہاری جھیل جیسی آنکھوں کی گہرائی میں اتر گیا تھا اور تم میرے خیالوں پر چھا گئی تھیں۔ میں اکثر تمہیں معنی خیز نظروں سے دیکھتا۔ نہارتا اور کبھی خواہش ہوتی کہ تمہیں اپنے خوابوں کی تعبیر بنا کر اتنی دور نکل جاؤں جہاں ہمیں ٹوکنے والا کوئی نہ ہو۔ اور کبھی دل چاہتا کہ تمہارے گالوں پر کھلے گلاب کی خوشبو سے اپنے من کی پیاس بجھالوں۔ مگر شاید تم میری ان کیفیتوں سے لاعلم تھیں یا میرے ارادے بھانپ کر تمہارے ہونٹوں پر خاموشی چھا جاتی تھی اور میں سخت مشکل میں پڑ جاتا تھا۔ کہیں تم برا نہ مان جاؤ۔ میری ذرا سی بھول تمہاری ناراضگی کا سبب نہ بن جائے۔ اگر میں تمہاری نظروں سے گر گیا تو کہیں کا نہ رہونگا۔

بڑی یگانگت اور بے گانگی کا ماحول تھا پھر بھی ہمارے درمیان اعتماد کی ایک خوشگوار فضا قائم رہی اور مجھے تمہیں پڑھاتے ہوئے برسوں گزر گئے۔ تم میٹرک میں تھیں اور میں ایم ایس سی کرنے کے

بعد نوکری کی تلاش میں تھا۔ پھر بھی میں نے تمہاری پڑھائی کا خاص خیال رکھا۔ بہتر رزلٹ کے لئے جس محنت اور مغز ماری کی ضرورت تھی وہ مغز پچی میں نے تمہارے ساتھ کی۔ میری محنت رنگ لائی اور تم جلد ہی اس قابل ہو گئیں کہ سارے لوگ تم سے اچھے رزلٹ کی امیدیں لگا بیٹھے اور ہوا بھی وہی۔ تم نے اپنے اسکول میں ٹاپ کیا اور شہر کے سب سے اچھے کالج میں داخلہ لے کر کلاس کرنے کالج جانے لگیں۔

لیکن تمہیں کالج جاتے ہوئے ابھی چند ہی ماہ ہوئے تھے کہ تم نے اچانک کالج جانا بند کر دیا اور پڑھائی چھوڑ دی۔ وقت کے مزاج کی یہ تبدیلی میری سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ کیا اسباب تھے کون سی مجبوری تھی۔ جو تمہیں پڑھائی چھوڑنے پر مجبور ہونا پڑا۔ حالات جوں کے توں تھے۔ کوئی فرق نظر نہیں آ رہا تھا۔ مگر یہ بات میرے لئے تشویس کا باعث بنی ہوئی تھی کہ اتنا بڑا قدم اٹھانے سے پہلے تم نے مجھ سے پوچھا تک نہیں۔ باتوں کی تہہ تک پہنچنے کے لئے میں نے پرشانت کو کئی بار ٹٹولا۔ بہت کرید اگر گتھی سلجھ نہیں پائی۔

لیکن اس روز جب میں ڈرائنگ روم میں بیٹھا پرشانت کو پڑھا رہا تھا کہ مجھے تمہارے قدموں کی آہٹ ملی۔ نظر اٹھا کر دیکھا۔ تم برآمدے میں کسی سے باتیں کرتی میرے سامنے سے گزر رہی تھیں۔ میں دل تھامے اپنی جگہ سے اٹھا لیکن زمین نے جیسے پاؤں جکڑ لئے اور تم مجھے بات کرنے کا موقع دئے بغیر اپنے کمرے کی جانب مڑ کر نظروں سے غائب ہو گئیں۔ تمہاری بے مروتی نے مجھے اداس کر دیا۔ میں حیران اور پریشان سا پرشانت سے کچھ کہے بغیر گھر لوٹ آیا۔ راستے بھر تمہاری بے اعتنائی مجھے ڈستی رہی۔ جس کے ساتھ میں نے زندگی کے اتنے بیش قیمت لمحات گزارے تھے۔ اس کے لئے میں اجنبی کیسے بن گیا۔ ہمارے درمیان غیریت کی دیوار کب اور کیسے حائل ہو گئی۔ فاصلہ اتنا بڑھ کیسے گیا۔ اسی ادھیڑ بن میں کئی روز گزر گئے۔ میں تم سے ملنے نہیں جا سکا۔

لیکن اس دن جب میں نے دل میں تم سے ملنے کی ٹھان لی اور تمہاری طرف گیا تو راستے میں تمہاری ایک سہیلی سے ملاقات ہو گئی اور انجانے ہی میں نے اس سے پوچھ لیا۔ تب مجھ پر اس راز کا انکشاف ہوا جس نے میری سوچ میں بدلے کی ٹیس بھر دی۔

مجھے کیا پتہ تھا کہ تمہاری نسبت پہلے سے طے تھی اور نہ یہ معلوم تھا کہ تمہارے رزلٹ کی خوش خبری پھیلتے ہی لڑکے والے شادی مانگنے آ گئے تھے۔ حالانکہ تمہارے والدین تمہاری پڑھائی کے طرفدار

تھے اور چاہتے تھے کہ تم کسی طرح گریجویشن کرلو۔ تب ہی بات آگے بڑھائی جائے۔ مگر لڑکے والے راضی نہیں ہوئے۔ مجبوراً تمہارے والدین کو حامی بھرنی پڑی اور بیاہ کا مہورت طے ہوگیا۔

کسی نے میرے خوابوں میں سیندھ ماردی تھی۔ اور میرا سب کچھ لوٹ لیا تھا۔ میں شکستہ دل چند لمحے کمرے میں بیٹھا پرشانت کو پڑھاتے ہوئے خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتا رہا۔ مگر بے کلی دور نہ ہوئی۔ جب دم گھٹنے کا احساس ہوا تو میرے قدم خود بخود باہر کی جانب اٹھ گئے اور ڈرائنگ روم سے نکلتے ہوئے راہداری میں مجھے تم مل گئیں۔ میں نے بلاجھجک تم سے پوچھ لیا۔

''یہ سب کیا ہوگیا۔؟'' تم نے پھٹی پھٹی نظروں سے میری طرف دیکھا اور بمشکل بول پائیں۔

''میں کیا بتاؤں۔؟'' اور پھر میری کچھ سننے سے پہلے ہی تم سر جھکائے خاموشی سے آگے بڑھ کر آنگن میں غائب ہوگئیں۔

تمہارے لہجے کی یہ نمک پاشی میرے غصے کو بھڑکا گئی۔ تم نے مجھے اندھیرے میں رکھا۔ اتنی مہلت کہاں دی کہ میں شادی کی بات چھیڑتا۔

ہم ملے تو اجنبی کی طرح تھے۔ لیکن دیکھتے ہی دیکھتے دوستی اتنی پکی ہوگئی کہ تمہارے بنا جینے کا اب کوئی مقصد نہیں رہا۔ میں نے تمہارے ہاتھوں میں زندگی کی پتوار سونپی تھی۔ کشتی پار اتارنا تو تمہاری ذمہ داری تھی۔ مجھے دریا کے بے رحم موجوں کے سہارے چھوڑ کر تمہیں کیا مل گیا۔؟ مگر میری دنیا تو مجھ پر تنگ ہوتی جارہی ہے اور میں جینے کا حوصلہ جٹا نہیں پارہا ہوں۔ میں نہ اپنی مرضی کا مالک رہا نہ ارادے میرے اپنے رہے۔ وقت نے بھی جیسے ساتھ دینا چھوڑ دیا ہے۔

اس روز جب تمہاری شادی کو محض دو دن رہ گئے تھے میں فکر میں ڈوبا گھر لوٹ رہا تھا کہ اچانک ایک نوجوان میرے راستے میں آگیا۔ میں نے بڑی ناگواری سے اس کی طرف دیکھا۔ مجھے حیرت ہوئی وہ میرے بچپن کا کبھی ساتھی رہا تھا۔ اس نے مجھے ٹٹولتی نظروں سے دیکھ کر میری پریشانیوں کا اندازہ لگالیا اور اس سے چھٹکارا پانے کی ایک تجویز میرے سامنے رکھ دی۔ سودا کوئی مہنگا نہیں تھا۔ بیس ہزار میں بات طے پاگئی۔ وہ بھی نصف پہلے۔ باقی کام ہوجانے کے بعد۔

دیکھنے میں تو ٹانگر بالکل چھوکرا سا لگتا ہے۔ لیکن ہے اپنے دھندے کا بہت ہی ماہر۔ اس کے

نشانے کبھی خطا نہیں ہوتے۔ مجھے لگا یہی ایک اچھا موقع ہے بدلہ چکانے کا۔ میرا پیار ٹھکرا کر تم نے میری بے عزتی کی ہے۔ اب تمہارا سہاگ اجاڑ کر ہی میرے من کی پیاس بجھے گی۔ اور میں نے جو سوچا وہی کیا۔

میں نے ٹائگر کی مانگ پوری کر دی اور اس دن کا انتظار کر رہا ہوں جب تم باہیں پھیلائے میری طرف آؤ گی اور تمہیں سہارا دینے میں وہاں موجود ہونگا۔

وہ ساعت آنے میں دیر بھی نہ لگی۔ تم اپنے کمرے میں دلہن بنی بیٹھی ہو۔ کم خواب کے سرخ جوڑے نے تمہارا چہرہ اور بھی دلکش بنا دیا ہے۔ ساری سہیلیاں تمہیں گھیرے بیٹھی ہیں۔ گجرے کی بھینی بھینی خوشبو سے کمرہ مہک رہا ہے۔

لڑکے والوں نے بھی بارات سجانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ روشنی کا بہت اچھا انتظام ہے۔ سڑک کے کنارے دونوں جانب جابجا ٹیوب لائٹ کی دودھیا روشنی اجالے بکھیر رہی ہے۔

آگے آگے باجے گاجے کا شور ہے۔ اس کے بعد تیز موسیقی کی دھن پر ناچتے اور کمر لچکاتے کچھ نوجوان اور کمسن بچے۔ پھر پھولوں سے سجی سجائی دولہے کی کار۔ اس کے پیچھے باراتیوں کی ٹکڑیاں۔

بارات بڑی آہستگی سے اپنی منزل کی طرف بڑھ رہی ہے۔ منٹوں کا فاصلہ اس نے گھنٹوں میں طے کیا ہے۔ مگر جیسے ہی بارات تمہارے دروازے کے سامنے آکر رکی ہے۔ بارات کے آخری سرے پر ایک زبردست دھماکہ ہوا ہے۔ اور کئی لڑکوں کے زخمی ہونے کی خبر گشت کرنے لگی ہے۔ چند لمحے پہلے جہاں خوشیاں بکھری تھیں۔ وہاں اداسی نے اپنے پر پھیلا دئے ہیں اور بڑی سرعت کے ساتھ ایک سوال میرے ذہن میں سرک آیا ہے۔ میرا تم سے کیا ناطہ؟ یہ تو میں خود نہیں جانتا۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ تمہیں کچھ ہو گیا۔ تو میرے لئے زندگی میں رہ کیا جائے گا۔ میں اپنی خوشیوں کی خاطر تمہیں اجڑنے نہیں دونگا۔ ہرگز نہیں۔ میرے افسردہ ہونٹوں پر زخمی مسکراہٹ آکر دم توڑ گئی ہے اور میں بے اختیار آگے کی جانب لپکا ہوں۔ تبھی گولیاں چلنے کی آواز سنائی دی ہے۔ میں ٹائگر اور دولہے کے درمیان پھنس گیا ہوں اور ایک گولی میرا سینہ چیرتی اندر جا کر کہیں اٹک گئی ہے۔ میں گر پڑا ہوں جسم سے خون کے فوارے پھوٹ رہے ہیں اور میرے ہونٹوں پر تمہارا نام آکر جیسے منجمد ہو گیا ہے۔

پھولوں کی آگ

کبھی کبھی وقت ایسا چیلنج بن کر سامنے آجاتا ہے کہ آدمی کی ہمت جواب دے جاتی ہے۔ کبھی ہاری ہوئی بازی جیت لی جاتی ہے اور کبھی جیتی ہوئی بازی کوئی ہار جاتا ہے۔ لیکن منزل کو پانے کے لئے تو حوصلہ چاہئے۔ لگن سچی اور ارادے پختہ ہوں تو راستے نکل ہی جاتے ہیں۔

اسے خوش اور مطمئن رکھنے کے لئے اگر میں نے اس کی مرضی کا ساتھ نہیں دیا تو اس کی کمزوری مجھے ستائے گی اور میرا جینا مشکل ہو جائیگا۔ کئی سال ہو گئے مجھے اس کے ساتھ کام کرتے ہوئے۔ دوسروں کے کام میں اس کی بے جا مداخلت، معاونین کے ساتھ اس کے اپنے اختیار کا غلط استعمال مجھے پسند نہیں۔

بعض اوقات میں یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہوں کہ اس کی زندگی میں کہیں کوئی خلاء ضرور ہے۔ یا تو اس کی ازدواجی زندگی خوشگوار نہیں ہوگی۔ یا پھر اس کے گھریلو حالات سازگار نہیں ہونگے۔ ورنہ اپنے آپ سے بے زار، خود سے اکتایا ہوا انسان، پریشانیوں سے چھٹکارا پانے کے لئے شراب کا سہارا کیوں لیتا؟

ونو دمحکمۂ بحالیات کا ایک سینئر افسر ہے اور میں اس کا اسٹینوگرافر۔ عمر کوئی چالیس پینتالیس کے درمیان رہی ہوگی۔ چہرے پر تھکن کے آثار آنکھوں میں مایوسی کی جھلک، بالوں کی سفیدی چھپانے کے لئے خضاب کا استعمال کرتا ہے۔ سامنے کے کئی دانت مصنوعی ہیں جو اصل سے میل نہیں کھاتے۔ بولنے پر اتر آئے تو بولتا خوب ہے۔ اسے لوگوں کو اپنی باتوں میں الجھانے کا سلیقہ بھی آتا ہے لیکن اس کے مزاج میں جو چڑ چڑا پن ہے وہ کبھی کبھی اس کے کردار سے ظاہر ہونے لگتا ہے۔ اس عمر کی شادی میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس نے بیوی کے ارمانوں کو صلیب پر چڑھا رکھا ہوگا۔ وہ اس کے دل میں اٹھتے ہوئے طوفان کی سرگوشیاں نہیں سن سکتا۔ اسی لئے اس خلش کو مٹانے کے لئے وہ اکثر اپنے ماتحتوں پر غصے اتارتا ہے۔ لیکن مجھے خود اپنے اس اندازے پر شک گزرتا ہے۔ غور کرتا ہوں تو مجھے ایسی کوئی بات نظر نہیں آتی۔ اسکے گھر کے حالات اچھے ہیں۔ کہیں کوئی بدگمانی نہیں۔ میں نے اس کے کمرے سے ہنسی کے فوارے

ملتے دیکھے ہیں۔اور نقرئی قہقہے کا ساتھ دیتی ہوئی بے میل ہنسی بھی سنی ہے۔

زمانے کا تماشہ بھی عجب ہے۔ ایمانداری سے کام کرو تو جینے نہیں دیتا۔ ایسے مسئلے سامنے
آجاتے ہیں کہ سلجھائے نہیں سلجھ پاتے۔ مجھ جیسا آدمی تو ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گا۔ میں وقت پر
آفس پہنچتا ہوں۔ سلیقے اور نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ سارے کام انجام دیتا ہوں۔ پھر بھی اس کی
جھڑکیاں سننی پڑتی ہیں۔ میں آج تک اسے سمجھ نہیں سکا۔ سمجھ میں نہ آنے والی کتاب کی طرح وہ مجھے
میرے ٹیبل پر بکھرا ہوا ملتا ہے۔ شروع میں تو وہ ایسا نہیں تھا۔ اب تو اسے یہ بھی احساس نہیں رہا کہ میں اس
کے قریب ہی ایک فلیٹ میں رہتا ہوں۔ اور فلیٹ بھی اس کے ایک واقف کار کا ہے جو مجھے اس کی سفارش
سے ملا ہے۔ اتنا قریب رہ کر بھی میں اس سے کتنا دور ہوں۔ اس دوری کو پاٹے بغیر سکھ ملنا مشکل ہے۔
زندگی جینے کے لئے آدمی کو کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑتا ہے۔

اس دن شام کو دفتر سے دانستہ میں اس کے ساتھ اس طرح نکلا کہ ایسا ہونا جیسے بالکل اتفاقیہ
ہو۔ راہ میں میں نے اسے کافی کی پیشکش کی جسے اس نے معمولی ہچکچاہٹ کے بعد قبول کرلیا۔ پھر ہم نے
پُررونق بازار کے ایک بڑے سے ہوٹل میں بیٹھ کر بیرے کو ہلکے ناشتے کے ساتھ کافی کا آوڈر دیا۔ بیرے
نے نہایت سلیقے سے سارے سامان سجا دیئے۔ ہملوگ کافی دیر تک کافی کی چسکیوں میں ڈوبے رہے۔
پھر اچانک اس نے پوچھا۔
''تم نے کبھی شراب پی ہے؟''
''اتنے پیسے کی نوکری میں تو چائے بھی نہیں ملتی۔ شراب کہاں سے آئے گی۔''
''شراب کے لئے تمہیں اپنی جیب نہیں دیکھنی پڑے گی۔؟''
''لیکن شراب مجھے پسند ہیں۔''

میں نے ہنسی میں اس کی بات کاٹ دی اور بل چکا کر باہر نکل آیا۔ اس نے جاتے ہوئے بڑی
خوبصورتی سے مجھے اپنے گھر آنے کی دعوت دے دی۔ میرا وار خالی نہیں گیا تھا۔ میرا ارادے کو بڑی
تقویت ملی اور دوستی کے مہرے اپنا کام کرنے لگے۔

اور پھر ایک دن آفس کی چھٹی سے پہلے ہی اس نے مجھے پکڑ لیا اور اپنے ساتھ دیر تک بازار

گھمانے کے بعد۔ کپڑے کی ایک اچھی سی دکان دیکھ کر اس میں داخل ہوا اور مجھ سے اپنی بیوی کے لئے ایک ساڑی پسند کرنے کی فرمائش کی۔ دکاندار نے اشارہ پاتے ہی کئی اچھی اور قیمتی ساڑیاں لاکر سامنے رکھ دیں۔ اسکی آنکھوں کی چمک دیکھ کر میں نے اس کی پسند کا اندازہ لگالیا اور ایک ساڑی نکلوا کر اس کی طرف بڑھادی۔ وہ بہت خوش ہوا۔ ساڑی واقعی خوبصورت تھی۔ جب اس نے بل چکانے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا تو میں اسے روک دیا اور اسکی مخالفت کے باوجود ساڑی کے پیسے دے دئے۔

اسے چھوڑ کر جب میں اپنے فلیٹ کی طرف بڑھنے لگا تو اچانک اسے جیسے کچھ یاد آ گیا۔ اس نے روک کر ساڑی میرے حوالے کردی اور کہا۔

''ساڑی تم نے خریدی ہے۔ خود سے شانتی کو دو گے تو اچھا رہے گا۔ ورنہ وہ میری بات کا یقین نہیں کرے گی!''

میں ہکا بکا رہ گیا۔ کتنا کھلے دل اور صاف ذہنیت کا آدمی ہے۔ اس کی اپنائیت مجھ پر گہرا اثر چھوڑ گئی۔ اس نے اس سادگی کے ساتھ اپنے گھر بلالیا کہ مجھ سے انکار نہ ہوسکا۔ اس کی نظروں میں عزت تو تھی ہی دل میں کئی نرم گوشے بھی بیدار ہو گئے۔ وہ مجھے لئے اپنے کمرے میں چلا آیا۔

شانتی مجھ سے بڑے خلوص سے ملی۔ جھکی جھکی نگاہوں سے میرا شکریہ ادا کیا۔ وہ مجھے نہایت سنجیدہ اور بڑی حساس لگی۔ اسے دیکھ کر میں مسحور سا ہو گیا۔ مجھے اس کا دل حالات کے اندھیرے میں کہیں الجھا ہوا لگا۔ وہ نیلم کی طرح ہشت پہلو درخشاں تھی۔ ونود اور اس کا میل مخمل میں ٹاٹ کا پیوند تھا۔ وہ ایسا دریا تھی جو ہمیشہ رواں دواں ہو۔ اور ونود تالاب کی مانند جامد اور پرسکون۔ وہ پھولوں کی طرح سفید اور آگ کی طرح سرخ تھی۔ اس کی بے بسی اور معصومیت پر مجھے ترس آگیا لیکن اس سے مجھے کیا مطلب؟ اس کے متعلق سوچنا بھی نہیں چاہئے۔ لیکن اس نے تو مجھ سے دوبارہ آنے کا وعدہ لے لیا۔

لیکن اس وعدے کے باوجود مجھے اس کے یہاں جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ لیکن ونود نے بھی جب مجھ سے اس بات کی شکایت کی تو مجھے سوچنا پڑا۔ وقت بڑا نازک ہے۔ لوگ بال کی کھال نکالا کرتے ہیں۔ اسے زمانے کا کوئی خوف نہیں۔ میری وجہ سے کسی نے اس کے خلاف کوئی قصہ گڑھ دیا تو میری بدنامی سے اس کی رسوائی کم نہیں ہو جائے گی۔ لیکن اسے تو ان سب باتوں سے جیسے کچھ لینا دینا ہی نہیں۔

نہ ان کے معمولات زندگی میں اس سے کوئی فرق پڑنے والا تھا۔

جب دوستی گانٹھی ہے تو ونود کا دل رکھنے کے لئے مجھے اس کے یہاں جانا ہی پڑا۔ کچھ کام ایسے بھی ہوتے ہیں کہ دل نہیں بھی چاہے تو کرنے پڑتے ہیں۔ پھر ونود کی تو بات کچھ اور تھی۔ اس کی ہدایت کے مطابق ایک ضروری فائل مجھے اس کے گھر پہنچانا تھا۔ میں وقت پر اس کے یہاں پہنچا۔ کال بل پر انگلی رکھی۔ ایک کم عمر لڑکا باہر نکلا تو میں نے اس سے ونود کے متعلق پوچھا۔ اس نے پہلے تو میرا جائزہ لیا۔ پھر بڑے ادب سے بولا۔

''صاحب کسی کام سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ رات دیر سے لوٹینگے۔ اگر کوئی خاص کام ہو تو کہیے۔ میں میم صاحبہ سے کہہ دوں۔؟''

''کام تو کوئی خاص نہیں۔ صرف یہ فائل انہیں دینا ہے!''

میں نے ونود کی عدم موجودگی میں شانتی سے ملنا مناسب نہیں سمجھا۔ اور لڑکے کو فائل دے کر لوٹ آیا۔ دوسرے دن جب میری نظر ونود پر پڑی تو اس نے مجھ سے شکائتی لہجے میں پوچھا۔

''کل تم آ کر لوٹ کیوں گئے۔''

''آپ نہیں تھے۔ فائل دے کر واپس ہو گیا۔''

''کیا گھر میں کوئی اور نہیں تھا۔ کچھ دیر انتظار تو کر لیا ہوتا۔ شانتی بھی شکایت کر رہی تھی۔ خیر آج آؤ۔ میں انتظار کرونگا۔''

''بہت بہتر۔''

میں ونود سے ملنے اس کے یہاں گیا۔ وہ گھر سے کچھ ہی دیر پہلے کسی کام سے باہر نکلا تھا۔ شانتی بڑے والہانہ انداز میں مجھ سے ملی۔ گھٹے گھٹے ماحول میں۔ دونوں دیر تک رنگین خیالوں میں کھوئے باتوں میں مصروف رہے۔ پھر بھی ونود نہیں لوٹا تو میں نے شانتی سے جانے کی اجازت چاہی۔ اس نے بڑے ہی خوبصورت انداز میں اپنی خفگی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھ لیا۔

''تم تو ہمیں غیر سمجھتے ہو۔؟''

''ایسی تو کوئی بات نہیں۔!''

''تو پھر آج میں تمہارے ساتھ کہیں گھومنے جاؤں گی۔ پارک چلو یا گارڈن!''

مجھے اس سے ایسی امید نہیں تھی۔ میں نے اپنے اندر بزدلی سی محسوس کی اور اپنی کمزوری کو چھپانے کی غرض سے پوچھا۔

''آپ میرے ساتھ چلیں گی۔ ونود بابو کو کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا۔''

''تم بھی کیسی باتیں کرتے ہو۔ وہ اتنے بدھو نہیں!''

اس نے مجھے ایک نئی الجھن میں ڈال دیا۔ بات کاٹنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ لیکن تب تک وہ تیار ہو چکی تھی۔ آج اس نے میری خریدی ہوئی ساڑی پہنی تھی۔ اس کے بلاؤز کا رنگ بڑا میچ کر رہا تھا۔ خوبصورت ساڑی اس کے جوان جسم پر خوب کھل رہی تھی۔ اس کا شکست خوردہ سوگوار چہرہ تازہ گلاب کی طرح شاداب تھا۔ آنکھوں میں شوخی اور لبوں پر مسکراہٹ لاتے ہوئے وہ میرے قریب چل آئی اور میری آنکھوں میں ڈوب کر بولی۔

''میں اس ساڑی میں کیسی لگ رہی ہوں؟''

میں سب کچھ بھولا ہوا تھا۔ گھبرا سا گیا...... ''وانڈرفل!''

اچانک میرے منھ سے نکلا۔ وہ میری بوکھلاہٹ پر ہنس پڑی۔ میں گم صم اسے تکتا رہ گیا۔ عجب عجب سے خیالات ذہن میں کوندتے رہے۔ اور پھر کچھ سوچے سمجھے بغیر۔ میں اسے ساتھ لے کر گھومنے نکل گیا۔

ہملوگ دیر تک ادھر اُدھر گھومتے رہے۔ وسیع شاہراہوں پر وہ میرا ہاتھ تھامے کتنی ہی دیر ٹہلتی رہی۔ اجنبی نگاہیں جسم میں پیوست ہوتی رہیں۔ دل میں خوف اور اندیشہ بنا رہا۔ ہم نے ساتھ بیٹھ کر ایک ہوٹل میں ناشتہ کیا۔ پھر چائے پی۔ جب زندگی کے ہنگامے اور شور وغل، رات کی خاموشی میں سونے لگے تو گھر واپس لوٹے۔

میرے قدم تھک سے گئے تھے۔ لگا جیسے میں بہت اونچے نیچے ٹیلے اور پتھریلی چٹانوں پر گھومتا ہوا ایک لمبا فاصلہ طے کر کے لوٹا ہوں۔ پورا فلیٹ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اور ونود اب تک نہیں آیا تھا۔

پھر کئی دن بیت گئے۔ مجھے اس کے یہاں جانے کی مہلت نہ مل سکی۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ میرے

ذہن کو اس اذیت ناک کرب سے فرار کی تلاش رہی۔ لیکن میں اپنی بے زاری کو دور نہیں کر سکا۔

ونود نے میرا اترا چہرہ دیکھا تو اس کے لہجے میں بھی اداسی سمٹ آئی۔ اسے جیسے میرے دکھ کا احساس ہو گیا ہو۔ وہ میرے سامنے صحت کے موضوع پر کافی دیر تک اپنے خیالات کا اظہار کرتا رہا۔

وہ مجھ پر کتنا مہربان ہے آج اس کا سہارا مجھے میری منزل کے بہت نزدیک لے آیا ہے۔ شانتی بھی بڑی فراخ دل عورت نکلی۔ اس کی سفارش پر مجھے ترقی مل چکی ہے۔ وہ میرا کتنا خیال رکھتی ہے۔ گھنٹوں بیٹھی میرے ساتھ بات بات پر قہقہے لگاتی ہے۔ ونود اکثر ٹور پر کہیں جاتے ہوئے مجھے اپنے گھر کا خیال رکھنے کی تاکید کر جاتا ہے۔ اسے جیسے مجھ پر بہت بھروسہ ہو۔

ایک رات جب سناٹے نے ماحول کی روشنی کو نگل لیا اور ہر طرف مکمل خاموشی چھا گئی تو میں نے اٹھتے ہوئے شانتی سے جانے کی اجازت چاہی۔ وہ ہلکے سے مسکرائی۔ میری طرف دیکھا اور چہرے پر دلآویز مسکراہٹ سجاتے ہوئے بولی۔

''آج میں تمہیں جانے نہیں دوں گی۔ ونود نے جو ایک چانس دیا ہے میں اسے کھونا نہیں چاہتی!''

شعلوں میں جلتا ہوا تسکین کے لئے ترستا ہوا بدن اینٹھ رہا تھا۔ اس کے انداز میں بڑی بے باکی بے حد اشتیاق اور درد تھا۔ میرا چہرہ عرق آلود ہو گیا۔ میں اپنے آپ کو دھوکہ نہیں دے سکتا۔ مجھے شانتی کی مسکراہٹوں میں زندگی کا زہر بھرا ہوا معلوم ہوا۔ اس کی آنکھوں میں سطحی جذباتیت کو دیکھ کر مجھے ایک لمحہ کے لئے اس سے نفرت سی ہو گئی۔ ایک پل اور ایک لمحہ میں سب کچھ بدل گیا۔ وہ میری طرف بڑھ رہی تھی۔ انتہائی بے تابی سے۔ مگر میں سنبھلا اور اسے اپنی ہی آگ میں جلتا چھوڑ کر وہاں سے نکل گیا۔ بجھتی چنگاری کی آواز بہت دور تک میرا پیچھا کرتی رہی۔

مگر یہ شاہراہ۔ جس کے کنارے زندگی کے قدم رک سے گئے ہیں۔ میرے لئے پلصراط بن گئی ہے۔ اور پیچھے ایک دشت بے پناہ۔ جہاں ابر گریزاں کا سایہ بھی ناپید ہے۔ آنکھوں میں اس کا سایہ گھوم رہا ہے۔ لگتا ہے جیسے میں بھاگ کر بھی بھاگ نہیں سکا ہوں۔

دوسرا کنارہ

اچانک شک کے کیڑے پریہ کے ذہن میں کلبلانے لگے اور وہ آگ بگولہ ہو کر آلوک پر برس پڑی۔

''یہ کون ہے۔ جس نے تم پر نظر رکھنے کے لئے اپنی تصویر تمہارے پاس رکھ چھوڑی ہے؟''

''یہ جان کر کیا کرو گی؟'' آلوک ہنس پڑا۔ پھیکی سی ہنسی۔

''تم نے مجھے دھوکے میں کیوں رکھا؟'' پریہ کا لہجہ سخت تھا۔ اس کے چہرے پر تجسس کی لہریں کانپ رہی تھیں۔

''تم مجھے غلط مت سمجھو پریہ! یہ قسمت کی ماری وہ لڑکی ہے جس کا حال تم سنو گی تو تمہیں بھی اس پر ترس آجائے گا!''

''ترس تو مجھے تم پر آرہا ہے۔ پوچھتی ہوں۔ تم نے میرے ساتھ پیار کا ناٹک کیوں رچا؟'' اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور وہ سامنے پڑے صوفہ پر سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

پریہ کی اس ناسمجھی پر آلوک بوکھلا سا گیا اور اس کی آنکھوں میں یادوں کے وہ دیپ جھلملانے لگے۔ جس کو لے کر پریہ کسی غلط فہمی کا شکار ہوئی تھی۔

آلوک پچھلے کئی سال سے ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں ملازم تھا۔ وہ ذہین، خوبصورت اور خوش مزاج تو تھا ہی۔ اپنی ذمے داریوں کو خوش اسلوبی سے انجام دینے میں بھی اسے مہارت حاصل تھی۔ اس کی محنت اور لگن نے جلد ہی اس پر کامیابی کے دروازے کھول دئے اور وہ کمپنی کے ایک نئے برانچ کا انچارج بنا کر دوسرے شہر بھیج دیا گیا۔

لیکن جس جگہ اس کی پوسٹنگ ہوئی تھی۔ وہاں کے حالات سے نہ تو وہ واقف تھا اور نہ وہاں کے کسی شخص سے اس کی جان پہچان تھی۔ اسی لئے اس نے کمپنی کے ایک ملازم سے اس کے ایک قریبی

رشتے دار کا پتہ لے لیا تھا تاکہ نئی جگہ اور نئے شہر میں اسے کسی اجنبی پن کا احساس نہ ہو اور اسی حوالے سے اس کی ملاقات پریہ سے ہوئی تھی۔

آلوک کی شخصیت ہی کچھ ایسی جادو اثر تھی کہ اس کے آتے ہی پریہ کو لگا جیسے اس کے گھر میں خوشبو کی بہار آ گئی ہو۔ ہمہ وقت آلوک کے چہرے پر مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔ اس کی زندہ دلی اور زندگی سے بھرپور قہقہے نغمے بن کر سب کے کانوں میں رس گھولتے رہے۔ جتنے دن وہ اس کے یہاں رہا۔ سب اس کی شخصیت سے متاثر رہے اور اس کی شرافت کے گن گاتے رہے۔ پریہ پر تو ایسا نشہ چھایا کہ وہ اس کی پرستار بن کر رہ گئی اور اسے اپنے خوابوں میں بسا لیا۔

پریہ سے مل کر آلوک کو بھی لگا جیسے پریہ اس کی زندگی میں آنے والی پہلی لڑکی تھی۔ جس کے وجود سے اس کو بے انتہا پیار ہو چکا ہے۔ اس کو اپنانے کی چاہ اس کے من میں انگڑائیاں لینے لگی۔

کچھ ہی دن بعد جب آلوک کو کمپنی کی جانب سے رہنے کو کوارٹر مل گیا تو اس نے پریہ کی میزبانی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس وعدے کے ساتھ جانے کی اجازت لے لی کہ جب بھی اسے موقع ملے گا۔ وہ اس سے ملنے ضرور آئے گا۔

پھر تو اس کا یہ معمول بن گیا کہ اتوار کی چھٹیوں میں وہ اکثر اس کے یہاں آنے جانے لگا۔ کبھی چھٹیوں میں گھر جاتے ہوئے اور کبھی گھر سے لوٹ کر آفس جوائن کرنے سے پہلے وہ پریہ کے یہاں ضرور رکتا۔ کبھی گھنٹہ دو گھنٹہ اور کبھی ہوا تو دو ایک دن۔ پھر تو ملاقاتوں کا یہ سلسلہ ان کے دلوں میں پنپتے پیار کے اظہار کا وسیلہ بن گیا اور دونوں ایک دوسرے کو دل و جان سے چاہنے لگے۔

رفتہ رفتہ ان کے پیار کی خوشبو آس پاس کی فضاؤں کو بھی مہکانے لگی۔ پریہ کے والدین بھی ان کی دوستی کے اس گہرے رشتے کو جانتے اور پہچانتے تھے۔ مگر نہ کبھی اسے ٹوکا اور نہ روکنے کی ضرورت محسوس کی۔ پریہ کوئی ناسمجھ تو تھی نہیں جو بلاوجہ ان کی دوستی پر اعتراض کرتے۔ اب تو وہ زمانہ آ گیا ہے کہ لاکھوں خرچ کر ڈالو...... مگر پسند کا لڑکا نہیں ملتا۔ نوکری پیشہ لڑکے کی تو بات ہی کچھ اور تھی۔

دونوں خوابوں کی دنیا میں کھوئے رہے۔ نئے گھروندے بنانے کی چاہ۔ ان کی امنگوں کو بڑھاوا دیتی رہی اور زندگی کے شب و روز یوں ہی گزرتے رہے۔

پھر اس روز......اتوار کی چھٹی میں جب وہ پریہ کے یہاں کچھ دیر کے لئے رکا تھا اور دونوں آمنے سامنے بیٹھے باتوں میں کھوئے تھے۔ کمرے کا ماحول بڑا خوشگوار تھا۔ پریہ کی نظریں آلوک کے چہرے پر جمی تھیں اور آلوک دریچے سے باہر درخت کی شاخوں سے الجھے ڈوبتے سورج کو دیکھ رہا تھا۔ انجانے ہی کچھ سوچ کر پریہ کا چہرہ حیا کی لالی سے سرخ ہو گیا اور اس کے دل کی بات اس کے منھ پر آ گئی۔ اس نے آلوک کے سامنے شادی کی تجویز رکھ دی۔ آلوک کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہ رہا۔ پریہ کی پیشکش نے اس کے خوابوں کو ایک خوش رنگ تعبیر دے دی تھی۔ آلوک نے بھی اسے اس بات کا یقین دلا دیا کہ اس بار وہ گھر جاتے ہی ماں کو سب کچھ بتا دے گا۔ وہ ماں کا بہت خیال رکھتا ہے۔ اس کی ذرا سی تکلیف بھی ماں کو بے چین بنا دیتی ہے۔ وہ کبھی اس کی مرضی کے خلاف نہیں جائے گی۔

کئی دن بعد جب آلوک گھر لوٹتے ہوئے ایک روز کے لئے پریہ کے یہاں رکا تو فضا خوش گوار اور موسم بڑا سہانا تھا۔ قریب کے ایک سنیما ہال میں ان کی پسند کی فلم لگی ہوئی تھی۔ دونوں نے پکچر دیکھنے کا من بنا لیا۔ اور جب پریہ اسے لینے اس کے کمرے میں آئی تو آلوک کپڑے بدل چکا تھا۔ کچھ کاغذات بستر پر پڑے تھے۔ اچانک پریہ کی نظر تکیہ سے دبے ایک خوبصورت سے کارڈ پر چلی گئی اور اس نے بے ارادہ اسے اٹھا کر دیکھ لیا۔

آلوک کے شناختی کارڈ میں اس کے فوٹو کی دوسری جانب ایک لڑکی کی تصویر تھی۔ نازک بدن، پتلے ہونٹ، گھنے ابرو، کشادہ پیشانی، ایک ہی نظر میں دل میں اتر جانے والی لڑکی کی معصوم صورت دیکھ کر پریہ کے ذہن میں شک کے کیڑے کلبلانے لگے اور وہ آگ بگولہ ہو کر آلوک پر برس پڑی۔ اس کے لہجے میں زندگی کے تمام دکھ سمٹ آئے تھے۔

آلوک نے اسے جتنا سمجھانے کی کوشش کی۔ اتنا ہی پریہ کے اندر غصے کی آگ بھڑکی۔ وہ سوچ میں پڑ گیا کہ آخر اپنی ذات پر پریہ کا اعتماد بحال رکھنے کے لئے وہ کیا کرے۔ تبھی ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور کھڑکیوں کے پٹ کھل گئے اور اس کی سوچوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ اس نے پریہ پر نظر ڈالی۔ اس کا چہرہ اس کے اندر چھپے درد کا اظہار کر رہا تھا۔ وہ گم سم اسی طرح سر پکڑے صوفہ پر بیٹھی تھی۔ اس نے اس کی غلط فہمی کو دور کرنے کی آخری کوشش کی اور اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔

تم نہیں جانتیں۔ گڑیا کولکتا کے مہندی بگان کی ایک مفلس اور بے سہارا لڑکی ہے۔ جس کا اس دنیا میں اس کی ماں کے سوا کوئی نہیں۔ بچپن میں ہی موت کے ظالم ہاتھوں نے اس کے باپ کو اس سے چھین لیا تھا۔ اکیلی ماں نے بہت دکھ جھیلے۔ مصیبتیں برداشت کیں اور کسی طرح اسے پال پوس کر بڑا کیا۔ اب وہی اس کی خوشیوں کا مرکز تھی۔ لیکن حالات کسی کے بس میں کہاں ہوتے ہیں۔ مصیبت آتی ہے تو کتنی بلائیں ساتھ لاتی ہے۔

گڑیا جب دس بارہ سال کی ہوئی تو ایک روز وہ اچانک بیمار پڑ گئی۔ اور بیمار بھی ایسی کہ ہفتوں بستر سے اٹھ نہیں پائی۔ گھریلو علاج سے کوئی فائدہ نہ ہوا تو ماں اسے شہر کے ایک خیراتی دواخانہ لے گئی۔ جہاں ہفتوں وہ ایک بڑے ڈاکٹر کے زیر علاج رہی۔ لیکن ڈاکٹر کو جب گڑیا کی حالت میں کوئی بہتری نظر نہیں آئی تو اس نے گڑیا کو سرکاری اسپتال لے جانے کا مشورہ دے دیا۔ جہاں وہ کئی ہفتے رہی۔ گڑیا اسپتال کے جس ڈاکٹر کے علاج میں رہی وہ بڑا ہمدرد اور غریب پرور نکلا۔ دوسروں کے کام آنے والے ایسے لوگ اب کہاں ملتے ہیں۔ ڈاکٹر نے اس کی حالت پر ترس کھا کر اس کے علاج کا مناسب بندوبست کر دیا۔ اور اسے دوا کے ساتھ پھل اور کھانے بھی اسپتال سے ملنے لگے۔ ڈاکٹروں کی ذاتی دلچسپی کا یہ اثر ہوا کہ گڑیا جلد ہی صحت یاب ہو کر گھر لوٹ آئی۔

کئی سال تو اچھے گزرے۔ کسی تکلیف کا کوئی احساس نہیں ہوا۔ لیکن کچھ دنوں بعد ایک بار پھر گڑیا بیمار پڑ گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے حالت ایسی بگڑ گئی کہ اسے اسپتال لے جانا پڑا۔

مرض بے حد پیچیدہ تھا۔ نئی بیماری تھی یا کسی دوا کا انفکشن۔ خون اور پیشاب کے نمونے لئے گئے۔ کئی طرح کی جانچ ہوئی۔ ساری رپورٹ دیکھنے کے بعد ڈاکٹروں نے بتا دیا کہ گڑیا کو بلڈ کینسر ہے۔ اس کے جسم کا خون بدلتے رہنا ہوگا۔ ورنہ یہ نہیں بچے گی۔

گڑیا کی ماں تو مفلس اور محتاج تھی۔ خون کے لئے اتنے پیسے کہاں سے لاتی۔ علاج مہنگا تھا اور جیب خالی۔ ماں اپنی قسمت کو کوس کر رہ گئی اور اسے اپنی ممتا کے جذبات پر صبر کی سل رکھنی پڑی۔

گڑیا کی جان لیوا بیماری اور اس کے گھر کی خستہ حالی سے پاس پڑوس کے لوگ بھی بے خبر نہیں تھے اور جس سے جو ہو رہا تھا وہ اس کی مدد بھی کر رہے تھے۔ مگر ایسی ہمدردی سے کیا فائدہ جو گڑیا کے کسی کام

نہ آسکے۔

جب گڑیا موت کے دہانے پر پہنچ گئی اور جینا مشکل ہو گیا۔ تب علاقے کے چند مزدور پیشہ نوجوانوں کے اندر کی انسانیت جاگی اور وہ گڑیا کی فریاد لے کر شہر کی کئی رضا کار تنظیموں سے ملے۔ خوش قسمتی سے ایک فلاحی ادارے نے گڑیا کی ذات میں دلچسپی دکھائی اور انسانیت کی خدمت کو اپنا فریضہ جان کر اس کے علاج کا بیڑا اٹھالیا۔

کئی تجربہ کار ڈاکٹروں کی ایک ٹیم نے اس بات کی تصدیق کر دی کہ گڑیا کو بلڈ کینسر ہے اس کی زندگی بچانے کے لئے تو خون کا انتظام کرنا ہی ہوگا۔

اخباروں میں خون کے لئے اشتہار نکالے گئے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر بھی خون دان کرنے والوں سے اپیلیں کی گئیں۔ جن کا بہت اچھا اثر ہوا۔ انسانیت کے نام پر شہر اور بیرون ریاست کے کئی نوجوان بطور عطیہ خون دینے کو تیار ہو گئے اور ہر سال گڑیا کے جسم کا خون بدلا جانے لگا۔

اب تو گڑیا کو خون دینے والے کئی نوجوانوں کا ایک گروپ تیار ہو گیا ہے۔ جو باری باری سے خون دیتے ہیں۔ اس گروپ میں میرا نام سر فہرست ہے۔ جس کے خون نے پریہ کو جینے کی نئی راہ دکھائی ہے۔ میں ہر سال گڑیا سے ملنے کو کولکاتا جاتا ہوں۔ وہ بھی رکشا بندھن کے موقع پر مجھے راکھی باندھنے آتی ہے۔ جس پر نہ تو اس کے گھر والوں کو کوئی اعتراض ہے اور نہ مجھ پر کسی طرح کی کوئی پابندی۔ یہ میرے اندر کی کمزوری تھی یا تمہاری ناراضگی کا ڈر کہ جب بھی تمہارے سامنے اس کا ذکر کرنا چاہا میری زبان گنگ ہو گئی۔

آلوک نے نہایت درد آمیز لہجے میں پریہ کے سامنے ساری سچائی رکھ دی اور اس کے چہرے پر ابھرے تاثر کو پڑھنے لگا۔ پریہ حیرت میں ڈوبی آنکھیں پھاڑے سب کچھ سنتی رہی۔

آلوک کا شناختی کارڈ اب بھی اس کے سامنے فرش پر پڑا تھا۔ جس سے جھانکتی گڑیا کی تصویر ...... کتنی خوبصورت کیسی پیاری اور معصوم لگ رہی تھی۔

بچا ہوا راستہ

سدھا کے بھائی اکھلیش نے بمل کو کہیں سے اٹھا لایا تھا۔

معاملہ بڑا نازک پراسرار اور سنسنی خیز تھا۔ بات کو پوشیدہ رکھنے کے لئے ہر طرح کی رازداری برتی گئی تھی۔ مگر بھاری احتیاط کے باوجود نہ جانے کیسے پورے گاؤں میں یہ خبر پھیل گئی کہ اکھلیش نے جو لڑکا پکڑ لایا ہے وہ کسی اچھے گھرانے کا بے حد خوبصورت لڑکا ہے۔ جس کے ساتھ سدھا بیاہی جا رہی ہے۔

حالانکہ ہر بات راز میں رکھی گئی تھی۔ کسی سے کچھ کہا نہیں گیا تھا۔ صرف گھر والوں کو تاکید کر دی گئی تھی کہ اندر کی کوئی بات باہر جانے نہ پائے۔ ورنہ سارا معاملہ بگڑ جائے گا۔

اندر خاصی گہما گہمی تھی۔ لیکن باہر پر ہول سناٹا۔ بھاگتے دوڑتے چہرے۔ بے رنگ پھیکے اور سراسیمہ نظر آ رہے تھے۔

جلدی جلدی پنڈت بلوائے گئے۔ لگن منڈپ تیار تھا۔ ہون کنڈ میں اگنی سلگا دی گئی۔ لوگ حیران تھے کہ سدھا کی زندگی کو داؤں پر لگا کر اس کے گھر والوں نے جو پانسا پھینکا ہے وہ کیا گل کھلائے گا۔ شادی بیاہ بچوں کا کوئی کھیل تو نہیں۔ بمل کے باپ نے کہیں سدھا کو بہو ماننے سے انکار کر دیا تو؟ یہ رشتہ کتنا بے معنی اور کیسا مضحکہ خیز ہو کر رہ جائے گا۔

پر ایسی شادیاں تو اب گاؤں کے علاوہ شہروں میں بھی ہونے لگی ہیں۔ نہ باجے گاجے کا شور، نہ لین دین کی کوئی بات، بس چٹ منگنی پٹ بیاہ، کسی نے جانا اور کسی کو کچھ خبر بھی نہیں ہوئی اور دولہا دلہن شادی کے رشتے میں بندھ گئے۔

برسوں پہلے کی بات ہے۔ گاؤں کے مکھیا کی بھتیجی کی شادی بھی اسی طرح ہوئی تھی۔ ایک روز جب مکھیا کی پسند کا ایک لڑکا۔ اپنے کسی دوست سے ملنے پاس کے گاؤں آیا ہوا تھا۔ تبھی مکھیا کو اس کی بھنک مل گئی۔ اسے اس سے اچھا موقع اور کیا ملتا۔ اس نے بساط بچھا کر اپنی چال چل دی۔ مہرے کامیاب رہے۔

اس نے ریوالور کے زور پر لڑکے کو اٹھوا کر اپنے یہاں منگوالیا اور اس کے ساتھ بھتیجی بیاہ دی۔

وہ تو خیر ہوا کہ لڑکے والے بے حد شریف اور عزت دار تھے۔ کسی کے بہکاوے میں نہیں آئے اور دریا دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے خاموشی کے ساتھ اس رشتے کو قبول کر لیا۔

لیکن شادی کا وہ واقعہ جو پچھلے سال اس کے ایک رشتے دار کے ساتھ پیش آیا تھا۔ بڑا اندوہناک ثابت ہوا۔ جس پر اب تک نہ تو وقت کی دھول جمی تھی اور نہ ہی اس کی تلخیوں کا اثر کسی کے ذہن سے اترا تھا۔

ایک روز جب لڑکا اپنی بہن کو سسرال پہنچا کر گھر لوٹ رہا تھا تبھی راستے میں لڑکی والوں نے بہلا پھسلا کر اسے ٹرین سے اتار لیا اور ڈرا دھمکا کر گھر لے آئے اور اس سے اپنی بیٹی بیاہ دی۔

مگر یہ شادی کسی کو راس نہیں آئی۔ لڑکے والوں نے اسے اپنی انا کا سوال بنا لیا اور ضد پکڑ لی کہ چاہے جو ہو...... وہ لڑکے والوں کو عدالت میں گھسیٹ کر رہے گا اور ہوا بھی وہی...... بات تھانے پولس سے بڑھ کر عدالت تک جا پہنچی۔ لڑکی کا جینا دوبھر ہو گیا اور ایک روز عاجز آ کر اس نے خودکشی کر لی۔

حالانکہ معاملہ خودکشی کا تھا۔ لیکن پولس کی ہمدردیاں لڑکی والوں کے ساتھ تھیں۔ اس نے جہیز مخالف قانون کے دفعات لگا کر لڑکے والوں کو پریشانی میں ڈال دیا۔ جس کی پاداش میں لڑکا اور اس کے کئی رشتے دار اب بھی جیلوں میں سڑ رہے تھے۔

بمل کا باپ تھا تو زمین دار گھرانے کا۔ لیکن زمینداری چلی جانے کے بعد حالت بہت خستہ ہو گئی تھی۔ پر قسمت نے ساتھ دیا اور بمل کی ماں کو ترکے میں ملی جائداد اس کے بہت کام آئی۔ گاؤں میں اس نے کئی ایکڑ قابل کاشت زمین پہلے ہی خرید رکھی تھی۔ سود پر پیسے لگانے لگا۔ بینک بیلنس بھی تھا۔ مگر مروت نام کو نہیں تھی۔

سدھا کھاتے پیتے گھرانے کی ایک پڑھی لکھی لڑکی تھی۔ خاندان اچھا تھا۔ ماں کو بھی شرافت اور نیک نامی ورثے میں ملی تھی۔ نئے زمانے کے طور طریقوں کا بھی اسے خیال تھا۔ سدھا کے ہوش سنبھالتے ہی اس نے اس کے لئے جہیز کی تیاری شروع کر دی تھی اور جب وہ جوان ہونے کو آئی تو باپ کو بھی اس کی شادی کی فکر ہوئی۔ اس نے اپنے کئی دوستوں سے بھی سدھا کے لئے ایک اچھا سا لڑکا ڈھونڈ نکالنے کو کہہ

رکھا تھا۔اپنے اور قریبی رشتے دار بھی اس تلاش میں اس کا ساتھ دے رہے تھے۔

سدھا کے لئے رشتے تو کئی آئے مگر کوئی جچا نہیں۔ان میں صرف ایک رشتہ ایسا تھا جس کو لے کر ابھی بات چیت چل رہی تھی۔

اسی درمیان ایک روز جب اکھلیش اپنے دوستوں کے ہمراہ کمرے میں بیٹھا چائے پی رہا تھا۔نہ جانے کیسے سدھا کے رشتے کی بات نکل آئی۔اور سب کا دھیان بمل کی ذات پر مرکوز ہو گیا۔سب اسی پر متفق تھے کہ بمل کے ساتھ سدھا کی جوڑی بڑی مناسب رہے گی۔تیکھے ناک نقوش والا بمل بہت سی خوبیوں کا مالک تھا۔اس کی دلنواز شخصیت سب کے من کو اتنا بھائی کہ ایک روز اکھلیش نے سدھا کے لئے بمل کا رشتہ مانگ لیا۔بمل کے باپ کو یہ بات بڑی ناگوار گزری۔اس کے خواب بہت اونچے تھے۔وہ بمل کی ذات پر خرچ ہونے والی رقم کی پائی پائی وصول کرنا چاہتا تھا۔حالانکہ سدھا کے والدین جہیز کے علاوہ بھی بمل کو بہت کچھ دینے کو تیار تھے۔مگر بمل کے گھر والے راضی نہیں ہوئے اور بات بننے سے پہلے ہی ٹوٹ گئی۔

اکھلیش کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔اس کے دوستوں اور بہی خواہوں کو بھی بڑا غصہ آیا۔اور انہوں نے ضد پکڑ لی کہ انجام چاہے جو ہو اب وہ سدھا کو بمل سے بیاہ کر ہی دم لینگے۔

اتفاق سے ایک روز انہیں یہ موقع مل بھی گیا۔بمل اپنے ایک دوست کی شادی میں شرکت کے لئے گاؤں آیا ہوا تھا۔اکھلیش نے اپنے آدمی اس کی ٹوہ میں لگا دئے اور واپسی کے دوران ایک جگہ راستے میں ہی آٹو رکشہ سے اتار لیا اور زبردستی جیپ میں ڈال کر گھر لے آئے۔

بمل جامد و ساکت لگن منڈپ میں بیٹھا تھا۔چہرے کی رنگت پیلی پڑ گئی تھی۔دل بیٹھا جا رہا تھا اور بے نور سی آنکھیں کسی نامعلوم سوچ میں ڈوبی تھیں۔پنڈتوں نے آکر آسن سنبھال لئے تو سدھا بھی بمل کے پاس لاکر بٹھادی گئی۔

لوگ لگن منڈپ کو گھیرے کھڑے تھے۔پراسرار خاموشی اور گہری ہو گئی تھی۔پنڈتوں کے ہونٹوں پر اشلوک تیزی سے پھسل رہے تھے۔وہ ہون کنڈ میں بار بار گھی کے چھینٹے بھی ڈال رہے تھے جس سے آگ کے شعلے رہ رہ کر لپک رہے تھے۔شعلوں کی لالی بمل اور سدھا کے چہروں پر بھی دمک رہی تھی۔

بے حد سہمے اور اکھڑے ہوئے ماحول میں بمل کی شادی سدھا کے ساتھ انجام پا گئی۔ وسوسوں کا ایک شامیانہ ان کے اوپر تن گیا۔ سارے ہنگامے افسردگی کی پرت میں دب کر ٹھنڈے پڑ گئے۔ مگر اکھلیش کی اس کارروائی سے گھر والوں کے دلوں میں جو خوف جڑ پکڑ چکا تھا۔ اس کے کم ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ سب اس لئے ڈرے اور سہمے ہوئے تھے کہ بمل کا گھرانہ تعلق والا ہے۔ بیٹے کو یوں کھو دینے کا دکھ انہیں چین لینے نہیں دے گا۔ ان کی انا اپنی تسکین کے لئے انہیں ہائی کورٹ تک ضرور لے جائے گی۔ اگر لڑکے نے ہوشیاری دکھائی اور عقل مندی سے کام لیا تو ٹھیک ہے ورنہ عدالت کے فیصلے تک تو سدھا کی زندگی جہنم ہی بنی رہے گی۔

بمل کی شادی کی خبر پھیلتے دیر نہیں لگی۔ گھر والوں نے سنا تو ششدر رہ گئے۔ ان کے غصے کا ٹھکانہ نہ رہا۔ ماں باپ کے ارمانوں کا جنازہ نکل گیا اور انہیں خبر تب ہوئی جب پاس پڑوس والے اپنی ہمسائگی کا حق ادا کرنے آئے اور اپنے دکھ کا اظہار کر کے ان کے غصے بھڑکا گئے۔

بمل کے باپ نے اس اپمان کا بدلہ چکانے کی ٹھان لی اور سدھا کے گھر والوں کو عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کرنے کا عہد لے لیا اور یہ بھی دھمکی دے ڈالی کہ وہ اپنے جیتے جی کبھی سدھا کو اس گھر میں چڑھنے نہیں دے گا۔

سدھا بڑی خوبصورت، خوش مزاج اور نیک سیرت لڑکی تھی۔ پہلی ہی ملاقات میں اس نے بمل کا دل جیت لیا اور اس کے من میں اپنے لئے پیار کی ایسی خواہش جگا دی جس کا بھولنا بمل کے بس میں نہیں رہا۔

کبھی کبھی برسوں ساتھ رہتے ہوئے بھی لوگ ایک دوسرے کو سمجھ نہیں پاتے۔ مدتیں درکار ہوتی ہیں ایک دوسرے کو جاننے اور پہچاننے میں۔ لیکن سدھا کو پا کر بمل کو لگا جیسے وہی اس کی سوچوں کا مرکز ہو۔ اس کے خوابوں کی تعبیر۔ جو کسی جستجو اور تلاش کے بغیر اسے سدھا کے روپ میں مل گئی تھی اور اس کے وجود کا وہ خلا پر ہو گیا تھا۔ جس کی کمی اسے ایک عرصہ سے ستا رہی تھی۔ وہ اس کی چاہت میں شرابور ہو کر سب کچھ بھول گیا۔ اسے یاد رہ گئی سدھا...... صرف سدھا۔ جس کے بغیر وہ نامکمل تھا۔

پھر تو دونوں نے مل کر اپنے اندر حالات سے نمٹنے کی ہمت جٹا لی اور دوسرے ہی دن بمل نے گھر

والوں کو جتاتے ہوئے یہ دھمکی بھی دے دی کہ...... یہ شادی اس نے اپنی مرضی سے کی ہے۔اس میں کسی اور کا کوئی قصور نہیں۔اگر کسی نے سدھا کے لئے اپنے گھر کا دروازہ بند کیا تو وہ بھی اس در سے ہمیشہ کے لئے اپنا ناطہ توڑ لے گا۔

بمل کے مزاج اور فطرت سے بھی واقف تھے کہ وہ اپنے ارادوں کا کچا نہیں۔جو سوچتا ہے کر گزرتا ہے۔اس کے باپ کو یہ بھی معلوم تھا کہ بیٹے کو بھی اس کی طرح فیصلہ بدلنے کی عادت نہیں۔اسے بمل کی ناسمجھی پر بڑا غصہ آیا۔مگر من مسوس کر رہ گیا۔

کچھ فیصلے ایسے بھی ہوتے ہیں جو نہیں چاہتے ہوئے بھی آدمی کو کرنے پڑتے ہیں۔زندگی کی سب سے بڑی بازی ہارنے کے باوجود اس نے ہنستے ہوئے بیٹے کی پسند کو قبول کر لیا۔

اور جب آشیرواد لینے کے۔لئے دونوں نے اس کے پاؤں چھوئے تو اس نے بمل اور سدھا کو بازوؤں سے پکڑ کر گلے سے لگا لیا۔

خوشی کا یہ لمحہ نہ جانے کیسا جذباتی تھا کہ سب کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

کفارہ

اچھے دن خواب کی طرح یوں گزر جاتے ہیں کہ کچھ پتہ ہی نہیں چلتا۔ لیکن جب وقت کی گردش میں آدمی کا مقدر جلتا ہے تب وہ لمحے کتنے کٹھن بن جاتے ہیں۔ من میں اتنی اُداسی سمٹ آتی ہے کہ ایک ایک پل صدیوں پر بھاری پڑنے لگتا ہے۔

گورو نے بھی ایک گھروندہ بنایا تھا، خوابوں کی ایک دنیا بسائی تھی۔ لیکن ایک ہی جھٹکے میں سب ٹوٹے ہار کے موتیوں کی طرح بکھر گئے۔ زندگی کربناک اندھیروں میں بھٹک رہی ہے دور تک اُجالے کا پتہ نہیں۔ اب تو لگتا ہے شاید ہی اس کی زندگی میں ایسا کوئی لمحہ آئے گا جب اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھرے گی۔

ذہن میں ماضی کی حسین یادوں کا تلخ احساس لئے وہ کمرے میں لوٹ آیا۔ وہی کمرہ، وہی بستر، وہی فضا۔ سب کچھ وہی تھا۔ صرف اس کی دنیا بدل گئی تھی۔ یہ بے رخی، یہ بیگانگی، اجنبی پن کا احساس، اسے کچوکے لگا رہا تھا۔ اسے کمرے میں گھٹن سی محسوس ہونے لگی۔ اس نے کھڑکی کے پٹ کھول دیئے۔ باہر جھانکا، ڈوبتا سورج اپنی کرنیں سمیٹ رہا تھا، نیلے بادل آسمان میں تیر رہے تھے۔ وہ پٹ تھامے باہر خلا میں گھورتا رہا۔ اس کی نگاہوں میں جمنا داس کی صورت گھوم گئی جس کی مہربانیوں کے پیچھے اس کے لئے نفرتوں کا کتنا بڑا الاؤ جل رہا تھا جس کی کڑواہٹ اس کے حلق میں کانٹے کی طرح چبھ رہی تھی۔ اس کی زندگی خود اس پر ایک بوجھ بن جائے گی اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔

برسوں پہلے جب وہ پرینا کے یہاں ایک ڈرائیور کی حیثیت سے بحال ہو کر آیا تھا تو اس کی تنخواہ گیارہ سو روپے ماہانہ تھی جو اس کی ذاتی دلچسپی اور پرینا کی مہربانیوں سے بڑھ کر دو ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ کار چلانا اور اس کی دیکھ ریکھ کے سوا اس کے ذمے کوئی اور کام نہیں تھا گھر کے کام کاج کے لئے الگ سے ملازم تھے۔

گیراج کے برابر میں ایک کمرہ اس کے رہنے کے لئے خالی کر دیا گیا تھا جس کی ایک کھڑکی گلی کی جانب کھلتی تھی۔ پرانی سی چوکی پر اس نے اپنا بستر لگا دیا تھا۔ اسٹیل کی دو کرسیوں کے علاوہ بانس کی ایک میز بھی کنارے پڑی رہتی تھی۔

اسے جمنا داس کے یہاں کام کرتے کئی ہفتے گزر چکے تھے۔ جمنا داس بڑی قد آور شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی مصروفیات بہت تھیں۔ گورو روزانہ صبح سویرے انھیں آفس چھوڑ آتا تھا مگر آفس سے لوٹتے وقت وہ زیادہ تر اپنے ڈپارٹمنٹ کی جیپ ہی استعمال کرتے تھے اور جیپ خالی نہ رہنے پر وہ گورو کو فون کر کے گاڑی منگوا لیتے تھے۔ گورو کی اصل ڈیوٹی تو پریناکو کالج لانے اور لے جانے کی تھی۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ پرینا اور اس کے والد دونوں گھر سے ساتھ نکلتے۔ گورو جمنا داس کو آفس میں چھوڑ کر پرینا کو کالج پہنچانے چلا جاتا۔ چھٹی کے وقت پرینا کالج کے احاطے میں اس کا انتظار کرتی۔ سیاہ رنگ کی امبیسڈر کار احاطے کے اندر آم کے پیڑ کے نیچے رکتی۔ گورو دروازہ کھولتا۔ وہ آنچل سنبھالے دھیرے سے کار میں بیٹھتی۔ جب وہ بیٹھ کر اندر سے دروازہ بند کر لیتی تب گورو کار اسٹارٹ کرتا۔

روز کا تقریباً یہی معمول تھا۔ زندگی ایک محور کے گرد گھوم رہی تھی۔

حالانکہ پرائیویٹ نوکری، جس میں آدمی کو ذرا سی بھول پر کسی کی ڈانٹ پھٹکار سننے کا ڈر لگا رہے۔ گورو کو پسند نہیں تھی۔ لڑکپن تو اس کا بڑے ٹھاٹ باٹ میں گزرا تھا۔ گھر میں دولت کی فراوانی تھی۔ سب اپنے تھے، مگر جب گھر میں سوتیلی ماں آئی تو سب بدل گئے۔ کچھ بھی اپنا نہ رہا۔ ایک روز جب آنگن کی دھوپ کرکری بن کر آنکھوں میں گڑنے لگی تو وہ نئی دنیا کی کھوج میں گھر سے نکل گیا جہاں پرینا سے اس کی ملاقات ہوگئی اور اسے رہنے کا ٹھکانہ مل گیا۔

رفتہ رفتہ یہ ملاقات دوستی میں بدل گئی۔ پرینا کی نرم مزاجی اور اس کے چاہت بھرے برتاؤ نے گورو کے آگے زندگی کی نئی راہیں کھول دیں اور دونوں خوابوں کی دنیا میں کھو گئے۔ انھیں لگنے لگا جیسے ان کے درمیان دوستی سے بڑھ کر اور کوئی رشتہ ہے۔ دوستی تو دوستی ہوتی ہے۔ اس سے آگے کچھ نہیں۔ مگر وہ تو اس موڑ پر تھے جہاں دوستی سے آگے پیار کرنے کی خواہش ہوتی ہے۔ پرینا کو بھی لگتا جیسے کوئی اپنا ہو۔ صرف اپنا۔ وہ گورو سے پیار کرنے لگی تھی۔ گورو کو بھی اس سے پیار جیسا ہو گیا تھا۔

حالاں کہ گوروا س بات سے بے خبر نہیں تھا کہ پیار کی راہ بڑی دشوار اور کٹھن ہوتی ہے۔ منزل کو پانے کے لئے جرأت چاہئے جو اس کے پاس نہیں تھی۔ وہ اکثر سوچتا کہ پر ینا کو پانے کی تمنا اس کے ارمان جلادے گی۔ تو پھر خود کو فریب دینے سے کیا فائدہ۔ مگر اسے تو اپنے آپ پر اختیار رہا نہیں تھا۔ صرف پر ینا کا عزم و حوصلہ اسے سہارا دئے ہوئے تھا۔

وہ دن اسے اچھی طرح یاد تھے جب ایک شام وہ کمرے میں بیٹھا کتاب دیکھ رہا تھا۔ غیر متوقع طور پر پر ینا اس کے کمرے میں چلی آئی۔ وہ ہڑبڑا کر اپنی جگہ سے اٹھا۔ بیٹھنے کو اس کی جانب کرسی بڑھائی۔

’’آپ نے یہاں آنے کی زحمت کیسے اُٹھائی میڈم۔ آواز دی ہوتی میں چلا آتا۔‘‘

مگر اس نے گورو کی باتوں کو اَن سنی کرتے ہوئے بڑی آہستگی سے پوچھا ’’کون سی کتاب دیکھ رہے تھے۔‘‘

’’بس یوں ہی پڑھ رہا تھا۔‘‘

’’یہ...... یہ تو شاید ایم اے والوں کے لئے ہے۔ تم کو اس سے کیا دلچسپی؟‘‘

وہ بات ٹالنے لگا۔ مگر وہ حقیقت جاننے پر بضد رہی۔

’’ہاں اب کے ایم اے انگلش میں دے رہا ہوں!‘‘

’’لیکن تم نے کبھی بتایا نہیں۔‘‘

’’بتانے کی ضرورت ہی کیا تھی!‘‘

’’تمہاری پڑھائی میں خلل تو نہیں ہوتی!‘‘

’’میں اپنی تیاری سے مطمئن ہوں مجھے وقت کی کمی کا کبھی احساس نہیں ہوا۔‘‘

’’پھر بھی تمہارا ہر لمحہ قیمتی ہے۔‘‘ پر ینا چلی گئی۔ وہ چاہ کر بھی اسے روک نہیں سکا۔

روزانہ وہ اسی طرح آتی۔ کچھ دیر رُکتی۔ چند لمحے باتیں کرتی اور چلی جاتی۔ ایک شام جب وہ حسب معمول آئی تو کمرہ اس کے وجود کی خوشبو سے مہک اٹھا مگر چند لمحے ٹھہر کر جب وہ جانے کے لئے مڑی تو گورو نے اسے ٹوک دیا۔ ’’آپ آتی ہیں تو کمرے میں اُجالا پھیل جاتا ہے۔ آپ اسے سمیٹنا چاہتی ہیں؟‘‘

’’نہیں!‘‘ پر ینا مسکرائی۔ اس کی طرف دیکھا اور بولی۔

''میں نہیں چاہتی کہ میرے آنے سے تمہاری پڑھائی کا نقصان ہو۔ پریرنا کو اس کی پڑھائی کا کتنا خیال تھا۔اس کی ہمدردی گورو کا سہارا بن گئی۔

ایک روز پریرنا نے اسے کسی کام سے اپنے کمرے میں بلایا تھا۔تبھی نوکرانی چائے کی ٹرے لے کر آ گئی۔اس نے خود پاٹ سے چائے بنا کر اس کی طرف بڑھائی تو پیالی پکڑتے ہوئے اس کا ہاتھ گورو کی انگلیوں سے چھو گیا۔گیت جیسے فضاؤں میں بکھر گئے۔ چائے کے چند گھونٹ لے کر اس نے گورو سے پوچھ لیا۔

''تاج کو تم نے دیکھا ہے؟''

''ہاں بہت خوبصورت ہے۔''

''مگر اس کے حُسن میں پیار کی خوشبو نہیں ملتی۔''

''محبت تو تاج میں دفن ہے۔''

دیر تک دونوں باتوں میں کھوئے رہے، ڈوبے رہے۔ پھر تو کوئی دن ایسا نہ ہوتا جب کالج سے لوٹتے ہوئے دونوں ایک ساتھ کسی ہوٹل میں بیٹھ کر چائے نہیں پیتے۔

کئی ماہ اور گزر گئے۔گورو کا رزلٹ نکلا۔وہ بہت خوش تھا۔وہ اپنی اس شاندار کامیابی سے پریرنا کو حیرت زدہ کرنا چاہتا تھا۔اس کی آنکھیں اسے تلاش کرتی ہوئی چھت پر چلی گئیں۔ جہاں کھڑی پریرنا گلاب کے پھولوں سے کھیل رہی تھی۔وہ اس سے ملنے اوپر چلا گیا۔

''آؤ!'' وہ اسے دیکھ کر بولی۔

گورو نے گلاب کا ایک پھول توڑ کر اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

''مجھے گلاب کے پھول بہت پسند ہیں۔ پریرنا بولی۔

''مجھے بھی'' گورو ہنس دیا تو پریرنا پوچھ بیٹھی۔

''آج بہت خوش نظر آ رہے ہو۔''

''ہاں! بات ہی کچھ ایسی ہے۔''

''تو پھر جلدی سے بولو نا'' اس سے صبر نہ ہو سکا۔تب گورو نے اخبار کا صفحہ اس کے سامنے کر دیا۔

''اوہ! وہ خوشی سے اُچھل پڑی۔ یہ کامیابی تمہیں مبارک ہو گورو۔ کہیں پروفیسر بن گئے تو بھول مت جانا۔''

''ایسی بات کیوں کرتی ہیں میم صاحب جن سے آدمی کا دل دُکھے۔''

''اگر تم نے دوبارہ مجھے میم صاحب کہا تو میں تم سے کبھی نہ بولوں گی!''

''اگر آپ خفا ہو گئیں تو میری زندگی ہی مجھ سے روٹھ جائے گی!''

''اتنی خوشیوں کے بیچ گورو آج میں خود کو اُداس کیوں محسوس کر رہی ہوں۔ دیکھو ڈیڈی کے آنے میں ابھی دیر ہے۔ ہم لوگ تھوڑی دیر کے لئے کہیں گھوم آئیں۔ شاید طبیعت بہل جائے۔''

''میرا بھی جی یہی چاہتا ہے۔'' گورو گیراج سے کار نکال کر لے آیا اور دونوں دریا کنارے جا پہنچے۔

ماحول بڑا خوشگوار تھا۔ دریا کی لہریں کناروں سے ٹکرا رہی تھیں اور دونوں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے دریا کی چنچل لہروں کا تماشہ دیکھتے رہے۔ پھر ساحل کنارے ایک اسٹال پر کھڑے ہو کر ٹھنڈے کا مزہ لیا اور ریت کے اوپر اپنے نام لکھ کر لوٹ آئے۔

مگر جب دونوں گھر پہنچے تو پریرنا کو پتہ چلا اس کی ماں کی ایک دوست کا فون آیا تھا۔ اس کے لڑکے نے انجینئرنگ کی پڑھائی پوری کر لی تھی اور اسے ایک سرکاری کمپنی میں کام کرنے کا آفر بھی مل چکا تھا لیکن اس کے گھر والے چاہتے تھے کہ شادی بیاہ کے جھنجٹوں سے فارغ ہو کر ہی لڑکا اپنی ڈیوٹی جوائن کرے۔ پریرنا سے اس کے رشتے کی بات تو بہت پہلے سے چل رہی تھی ایک روز دونوں کی شادی کا مہورت بھی طے ہو گیا۔

پریرنا حیران رہ گئی۔ گورو کی آنکھوں میں بھی گہرا سناٹا چھا گیا۔ پلکوں پر آنسو لرز اٹھے۔ کتنی یادیں، کتنے غم، کتنے طوفان پنہاں تھے ان چند قطروں میں۔

اس درمیان پریرنا گورو سے بالکل نہیں مل پائی۔ نہ جانے اس پر گھر والوں کا دباؤ تھا یا زمانے کی پابندیاں۔ یا پھر ایک کو پا کر دوسرے کو بھولنے کی خواہش تھی۔ اس کی یہ خاموشی گورو کے لئے سوہان روح بن گئی۔ وہ مضطرب اور پریشان ہوا تھا اور اضطراب کے اسی عالم میں ایک روز وہ اپنی ٹوٹتی ہوئی امیدوں کا سہارا لے کر پریرنا سے ملنے اس کے کمرے میں چلا گیا۔ پریرنا کا چہرہ اُداس اور آنکھیں ویران تھیں۔

دونوں نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا مگر لب ہلنے بھی نہ پائے تھے کہ نہ جانے کس ضرورت سے جمنا داس پریرنا کے کمرے کی طرف چلے آئے۔ انھیں دیکھ کر گورو کا چہرہ فق پڑ گیا۔ کاٹو تو بدن میں خون نہیں۔ جمنا داس کے من میں جو بات کھٹک رہی تھی وہ سامنے آ گئی۔ وہ آگ بگولہ ہو گئے پھر گورو کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کرتے ہوئے وہ کمرے سے نکل گئے اور اپنے کمرے کے صوفے پر خود کو گراتے ہوئے گورو پر برس پڑے۔

''اس سے پہلے کہ تمھیں دھکے دے کر نکالا جائے، تم خود سے چلے جاؤ۔ ابھی اور اسی وقت۔''

گورو کے کانوں میں جیسے کسی نے گرم سلاخیں اُتار دی ہوں۔ مگر ایک لفظ بھی زبان سے نکال نہ سکا۔ اس نے جمنا داس کی طرف دیکھا اور اُس کی نگاہ ان پر جمنے سے پہلے ٹیبل پر رکھی ایک تصویر سے جا ٹکرائی۔ اسے بڑی حیرت ہوئی۔ اس نے تصویر ہاتھوں میں لے کر جمنا داس سے پوچھا۔

''یہ تصویر آپ کو کہاں سے ملی۔''

''اس سے تمھیں مطلب؟''

''مطلب ہے تبھی تو پوچھ رہا ہوں۔''

''تمھیں غلط فہمی ہوئی ہے۔''

''یہ تصویر نو برسوں سے میری نگاہوں میں ہے جب بھی نظریں نیچی کرتا ہوں، ماں کو سامنے پاتا ہوں!''

جمنا داس کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ چہرے پر پسینے آ گئے۔ وہ خلاؤں میں گھورنے لگے۔ یک ٹک وہ آدمی نہیں جیسے کوئی بت ہوں۔ ان کے اندر کتنے گھاؤ رس رہے تھے۔ انھیں کالج کا وہ زمانہ یاد آنے لگا جب وہ مالا کو اپنا دل دے بیٹھے تھے۔ مالا تھی بھی بہت خوبصورت۔ دونوں ایک ساتھ پڑھتے ہوئے دیوانگی کی حد تک ایک دوسرے کو چاہنے لگے تھے۔ مگر مالا ایک انجینئر کی بیٹی تھی۔ گھر والوں کو داماد بھی انجینئر چاہیے تھا۔ حسب منشا جب لڑکا مل گیا تو انھوں نے مالا کی شادی کر دی۔ مگر مالا اس دکھ کو زیادہ دنوں تک جھیل نہ سکی۔ اور ایک لڑکے کو جنم دے کر دنیا سے رخصت ہو گئی۔ گورو بالکل اپنی ماں پر گیا تھا۔ پہلی بار جب گورو نوکری کی امید لے کر ان سے ملا تھا تو وہ اسے دیکھ کر مالا کی یادوں میں اس طرح کھو گئے تھے کہ

انھوں نے اس سے کچھ پوچھنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی اور اسے اپنے یہاں کام پر رکھ لیا تھا۔

گورو دل شکستہ اپنے کمرے میں لوٹ آیا۔ اور آج وہ اس کمرے میں اجنبی تھا۔ اچھے وقت خوابوں کی طرح بے حقیقت بن جاتے ہیں اور جب وہ اپنا مختصر سامان اٹھا کر کوٹھری سے ہمیشہ کے لئے اس گھر کو چھوڑنے کے ارادے سے نکلا تو جمنا داس کی شفیق و نرم آواز آئی۔

''بیٹے!''

اس نے پلٹ کر دیکھا۔ جمنا داس اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔

''میں تمہارا گناہ گار ہوں اور آج مجھے اس کا کفارہ ادا کرنا ہے۔ اب تم یہاں نہیں اندر مکان میں رہو گے۔''

یہ کہتے ہوئے انھوں نے گورو کو گلے سے لگا لیا اور ان کے چہرے پر ایک اُداس مسکراہٹ پھیل گئی۔

رشتے کا پاس

بے خیالی میں آئینہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

کانچ کے ٹوٹنے کی دلخراش آواز دیر تک کمرے میں گونجتی رہی اور اس نے پاگلوں کی طرح بکھری ہوئی کرچیوں کو چن کر اپنے ہاتھ لہولہان کر لئے۔ یہ وحشت کی دلیل تھی۔ محبت کا انجام نہیں اور جنوں میں تو آدمی حد سے گذر جاتا ہے۔

ارچنا کی جدائی کا غم ابھی تازہ تھا۔ انگلیوں کے پوروں سے ٹپکتے ہوئے خون کی طرح۔ اس کے باپ کا کہنا تھا کہ ہمارے یہاں غیر ذات میں لڑکی بیاہنے کا دستور نہیں اور اس نے اسے بیٹی دینے سے انکار کر دیا تھا۔

ارچنا بھی اتنی بزدل اور کمزور نکلی کہ باپ کے فیصلے کے خلاف کچھ بول ہی نہیں پائی۔ اور نیرج سے کئے ہوئے وعدے اسے یاد نہیں رہے۔ ماضی کے بہلاوے کی طرح سب قسمیں سب وعدے بے اثر ہو گئے۔

ارچنا اس کی کلاس فیلو تھی۔ دیکھنے میں خوبصورت، لمبا قد، کتابی چہرہ، سرگیں آنکھیں اور آواز میں گیتوں کی سی مٹھاس۔ کلاس کی دوسری لڑکیوں کی طرح نہ تو وہ بالکل الگ تھلگ رہنے والی تھی اور نہ ہی لڑکوں میں بلاوجہ گھل مل کر بہت زیادہ باتیں بنانے والی۔ لڑکے چاہتے ضرور تھے کہ وہ ارچنا کے قریب آئیں۔ لیکن اس نے کبھی کسی کو لفٹ نہیں دی۔ وہ تو محض اتفاق تھا جو انجانے میں ہی دونوں کو ایک دوسرے کے قریب آنے کا بہانہ بن گیا۔

اس روز کالج کا سالانہ جلسہ تھا۔ جس میں طالب علموں کی طرف سے ناٹک اور کئی طرح کے ادبی پروگرام پیش کئے گئے تھے۔ ارچنا کو بھی اپنی آواز کے جادو جگانے کا موقع ملا۔ اس کی آواز بڑی سریلی اور مترنم تھی۔ درد بھرے گیت کو اس نے اس خوبصورت انداز میں گایا کہ لوگ اس کی تعریف کئے بنا نہیں رہے۔ پروگرام بے حد کامیاب رہا۔

یوں تو ارچنا کو اس کی کامیابی پر مبارکباد دینے والوں میں کالج کے اساتذہ بھی تھے۔ اس کی جان پہچان کے لڑکے اور سہیلیاں بھی۔ وہ سب کی محبتوں کا جواب مسکراہٹوں سے دیتی رہی۔ لیکن نیرج کی مبارکباد قبول کرتے ہوئے ارچنا کو لگا کہ اس کی آنکھوں میں اپنائیت کی جو لہر اٹھی ہے۔ کہیں وہ اس کے وجود کو پگھلا کر نہ رکھ دے۔ اس کے ہونٹوں سے الجھی مسکراہٹ کافور ہو گئی اور حیا کے بوجھ سے پلکیں جھک گئیں۔ اس کا چہرہ کسی پھول کی طرح کھل رہا تھا۔ اس کی معصوم صورت نیرج کے من کو ایسا بھائی کہ وہ اسے دل دے بیٹھا۔

کالج کے جلسے کی اس کامیابی نے ان کی زندگی کو ایک نئی سمت دے دی۔ اور دونوں پیار کی انجانی راہوں پر چل پڑے۔ کالج کا رومان پرور ماحول ہو۔ تفریح گاہوں کی گہما گہمی۔ یا بھیڑ بھاڑ والے کسی ہوٹل کا کوئی پر سکون گوشہ۔ دونوں تنہائیوں میں بیٹھے دیر تک باتیں کرتے۔ دل کی دھڑکنوں میں اپنی چاہتوں کا رنگ بھرتے۔ ساتھ جینے کا عہد اور ساتھ مرنے کی قسمیں کھاتے۔ وفا کی چھاؤں میں پیار و محبت کی بیلوں کو پھلنے پھولنے کا خوب موقع ملا اور دونوں ایک دوسرے کو جنون کی حد تک چاہنے لگے۔

وقت کا پنچھی پر پھیلائے اڑتا رہا۔ دھیرے دھیرے کئی ماہ و سال بیت گئے۔ ملنے ملانے کی تڑپ اور گھنے درخت کی چھاؤں میں پیڑ کی ابھری جڑوں پر لہراتے سائے ان کی محبتوں کے گواہ بن گئے۔

مگر قدرت کی مرضی کے آگے کسی کا بس نہیں چلتا۔ ہونی کبھی نہیں ٹلتی۔ وقت کا فیصلہ اپنی جگہ اٹل تھا۔

بی اے کا آخری سال تھا۔ دونوں امتحان کی تیاریوں میں جٹے تھے۔ ارچنا نے خوب محنت کی۔ جی لگا کر امتحان دیا۔ مگر نیرج تو ارچنا کی ذات میں ایسا کھویا تھا کہ اسے اپنے آپ کی بھی خبر نہیں رہی۔ کتابیں سامنے کھلی ہوتیں اور وہ ارچنا کے تصور میں ڈوبا رہتا۔ امتحان کی گھڑی آئی تو جوں توں کر کے امتحان دے دیا۔

نتیجے میں ارچنا اپنے کالج کی ٹاپر بنی اور نیرج فیل کر گیا۔ اور اس کی یہ ناکامی اس کا مقدر بن گئی۔ ارچنا بہت پچھتائی۔ نیرج کی ناکامی سے وہ ایسا دل برداشتہ ہوئی کہ اس نے پڑھائی چھوڑنے میں ہی اپنا بھلا سمجھا۔

ارچنا کے گھر والوں کو جب اس کے ارادے کی جانکاری ملی تو پڑھنے نہ پڑھنے کا معاملہ اس کی مرضی پر چھوڑ دیا اور سبھی اس کے لئے ایک اچھے برسرروزگار لڑکے کی تلاش میں جٹ گئے۔

اور جلد ہی ارچنا کے ساتھ وشال کے رشتے کی بات چل پڑی۔ ہوایوں کی وشال کے والدین کو اپنے لڑکے کے لئے کسی مناسب لڑکی کی تلاش تھی اور ارچنا کے لئے بھی لڑکا کھوجا جا رہا تھا۔ کسی نے درمیان میں پڑ کر باتوں کی کڑی سے کڑی ملادی۔

وشال کے ساتھ ارچنا کا رشتہ بڑا معقول تھا۔ انکار کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ جہاں ارچنا پڑھی لکھی اور سلیقہ مند لڑکی تھی۔ وہیں وشال بھی خوبرو، خوب سیرت اور برسرِ روزگار انجینئر تھا اور خاندانی لحاظ سے بھی دونوں ہم پلہ تھے۔

دین لین کا سارا معاملہ بڑی خوبصورتی سے طے پا گیا اور شادی کی تاریخ مقرر ہوگئی۔ حالانکہ ارچنا نے اس فیصلہ کے خلاف بہت واویلا مچایا۔ خوب روئی، گڑگڑائی۔ باپ کو منوانے کے لئے ماں سے روٹھی۔ کئی دنوں تک دانے پانی کو ہاتھ نہیں لگایا۔ لیکن سب بے سود۔ باپ کی مرضی اور اس کی ضد کے آگے وہ زیادہ دیر تک ٹک نہ سکی اور ہار مان گئی۔

وقت کے ساتھ جیسے سب کچھ بدل گیا۔ ٹوٹتے بکھرتے رشتے۔ بے چین آنکھوں کی اچٹتی نیندیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے ارچنا کسی اور کی ہوگئی اور وہ کچھ نہیں کر سکا۔ دل میں ایک خلش سی جاگی اور صدمے نے نیرج کو اندر سے توڑ کر رکھ دیا۔ اس نے کیا سوچا تھا اور قسمت اسے کہاں لے آئی۔ اور پھر اسے من کی بے قراری کو دور کرنے کے لئے وقت سے سمجھوتہ کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اور وہ ماضی کے تمام دکھ پی کر۔ دھیرے دھیرے ارچنا کے خیالوں کو ذہن سے اتارنے لگا۔

اور پھر ایک روز ایسا بھی آیا جب اس نے اپنے ہاتھوں سے اپنی تقدیر لکھنے کا فیصلہ کرلیا۔ اور کتابوں کی دنیا میں لوٹ کر اپنی مصروفیت بہت بڑھالی اور پڑھائی کو ہی زندگی کا نصب العین بنالیا۔

رفتہ رفتہ وقت کے مزاج میں تبدیلی آئی اور قسمت نے بھی ساتھ دیا۔ کالج کی فضا اسے بہت راس آئی۔ بی اے میں اس نے ٹاپ کیا اور گولڈ مڈل سے نوازا گیا۔ اس نے پڑھائی جاری رکھی اور پھر کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ ایم اے اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں لینے کے ساتھ اس نے سول سروسیز کے مقابلہ

جاتی امتحان کی تیاری بھی شروع کردی اور جلد ہی اسے اپنی جاگتی آنکھوں کے خوابوں کی خوبصورت تعبیر مل گئی اور تربیتی عمل پورا کرتے ہی اسے حکومت کے ایک کلیدی عہدے پر تقرری کا پروانہ مل گیا۔

نیرج کو اپنی ذمہ داریوں کا پورا احساس تھا۔ کبھی اپنے کام میں غفلت نہیں برتی۔ ہمیشہ اپنے فرض منصبی کو خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیا۔ لوگ اس کی محنت، لگن اور ایمانداری کے قائل ہو گئے اور جلد ہی اس کا شمار انتظامی صلاحیتوں کے اعلیٰ عہدیداروں میں ہونے لگا۔

دھیرے دھیرے اس کی ملازمت کو کئی سال گزر گئے۔ اس درمیان نہ نیرج کو ارچنا کی کوئی خبر ملی اور نہ ارچنا کو پتا چلا کہ نیرج کہاں اور کس حال میں ہے۔

تب ہی اچانک ایک عجب حادثہ اس کی زندگی میں رونما ہوا۔ جس نے اس کے دل و دماغ میں ہلچل سی مچا دی۔ معاملہ ایک بڑے گھوٹالے کی تحقیقات کا تھا۔ جب محکمۂ تعمیرات کے ایک انجینئر کے خلاف غبن کا ایک معاملہ سامنے آیا تو اس کی تحقیقات کے لئے سرکار کی نظرِ انتخاب نیرج پر پڑی۔ چیف انجینئر وشال پر کروڑوں روپے خرد برد کرنے کا الزام تھا۔ اور جانچ کے لئے جو کمیشن تشکیل دی گئی اس کا سربراہ نیرج کو بنایا گیا۔

کام بڑی ذمہ داریوں کا تھا۔ راہ بڑی کھٹن اور دشوار تھی۔ لیکن وہ دوراندیش حقیقت پسند مزاج اور اپنے اصول کا پکا افسر تھا۔ اس نے تحقیقات میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ چھان بین کے دوران کئی مرحلے ایسے بھی آئے۔ جب اسے اپنی ذات کے کرب سے بھی گزرنا پڑا۔ بڑی بڑی سفارشیں پہنچائی گئیں۔ رشوت کے نام پر لاکھوں کا آفر ملا مگر اس نے کسی ایک کی نہ سنی۔ اسے اپنے ضمیر کا سودا کسی حال میں منظور نہ تھا۔

تب ڈرانے دھمکانے کے ساتھ اسے جان سے مار ڈالنے کی دھمکیاں دی گئیں۔ لیکن وہ اپنے ارادے میں ٹس سے مس نہ ہوا۔ اور تمام مخالفتوں کے باوجود اس نے معاملے کی تہہ تک پہنچ کر ہی دم لیا۔

وشال پر دھوکہ دھڑی کا الزام سچ ثابت ہوا۔

تب ایک روز ارچنا نے نیرج سے ملنے کا فیصلہ کرلیا اور اس شام وہ اس کی رہائش گاہ پر جا دھمکی۔ نیرج کہیں جانے کی تیاری میں تھا۔ پورٹیکو میں کار کے رکنے کی آواز سن کر اس نے خود ہی دروازہ کھولا۔

ارچنا سیڑھیاں چڑھ کر دروازے پر پہنچ چکی تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور دیکھتے رہ گئے۔ اچانک نیرج کو سامنے پاکر ارچنا کے ہونٹوں پر لرزش آ گئی اور بدن کانپ اٹھا۔

نیرج کے ذہن کے دریچے پر رکھی ارچنا کی تصویر تو دھول میں اٹ کر کب کی دھندلی پڑ چکی تھی لیکن ایک بار پھر۔ اس نے سامنے آکر اس کے وجود کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ جس کے کرب سے اس کی روح تک تڑپ اٹھی تھی۔ اس نے خود کو سنبھالا اور اپنے انداز میں بے نیازی برتنے کی کوشش کی تب تک ارچنا بھی اپنے آپ پر قابو پا چکی تھی۔ اس نے ملتجی نگاہوں سے نیرج کی طرف دیکھا اور کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔

''یہ تو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ میں جس افسر سے ملنے جارہی ہوں۔ اس کی صورت میں تم مجھے یہاں ملو گے۔'' ''تم نے بہت ترقی کرلی نیرج۔ اور کہو کیا حال ہے؟

''سب ٹھیک ہے۔ تم کہو اتنے دنوں بعد۔ اچانک کیسے آنا ہوا؟''

دونوں باتیں کرتے ہوئے ڈرائنگ روم میں آ گئے اور ایک ہی صوفہ کے دو کناروں میں بیٹھ گئے۔ تب ارچنا بولی۔

''نیرج میری زندگی کا ایک سوال تمہارے جواب کا منتظر ہے۔''

''چلو چھوڑو ان باتوں کو یاد کرنے سے کیا فائدہ۔ جن پر ہمارا اختیار نہیں!

''تم سمجھے نہیں۔ میں وشال کی بات کر رہی ہوں!''

''کون وشال۔ کہیں وہ چیف انجینئر تو نہیں۔!''

''ہاں وہی!''

''لیکن اس پر تو الزام ثابت ہو چکا ہے!''

''اسی لئے تو آئی ہوں!''

''لیکن اس معاملے میں تمہیں پڑنے کی ضرورت کیا تھی؟''

''وہ میرے ہسبنڈ ہیں اور تم سے اس بات کی بھیک مانگنے آئی ہوں کہ اسے بچا کر تم میری زندگی مجھے لوٹا دو!

ارچنا کے لہجے میں بے پناہ درد تھا جس کی ٹیس نیرج کو بھی تڑپا گئی وہ بولا۔

''اوہ تم نے بہت دیر کر دی ارچنا!''

''لیکن موقع ابھی ہاتھ سے نکلا نہیں ہے۔تم چاہو تو رپورٹ جمع کرنے سے پہلے اپنا فیصلہ بدل سکتے ہو۔!''

''نہیں میں ایسا نہیں کر سکتا۔یہ میرے اصول کے خلاف ہے۔''

''لیکن تمہیں گنجائش نکالنی ہوگی۔میری خاطر۔بہت امید لے کر تمہارے پاس آئی ہوں!''

''مجھ سے یہ نہیں ہوگا۔میں اپنی مرضی کے خلاف کام نہیں کرتا۔''

ارچنا کا دل ٹوٹ گیا۔آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔وہ بنا کچھ بولے۔افسردہ اور اداس سی اٹھی اور نیرج کی آنکھوں میں اپنی یادوں کی کسک چھوڑ کر کمرے سے نکل گئی۔

نیرج کشمکش میں پڑ گیا۔زندگی انجانے ہی ایسے دوراہے پر آ پھنسی تھی۔جس کے آگے پر خطر راہیں تھیں اور پیچھے گرداب کی ہلاکت خیزیاں۔وہ ساری رات جاگتا رہا۔اور آخر کار اس نے ایک فیصلہ کر لیا اور اپنی جانچ رپورٹ تلف کر دی۔

دوسرے دن کے اخباروں میں نیرج کے استعفیٰ کی خبر پڑھ کر ارچنا کا دل آزردہ ہو گیا اور ضبط کے باوجود اسنے ٹیس محسوس کی۔لیکن خوشی بھی محسوس ہوئی کہ وشال بچ گیا تھا۔

منزل سے آگے کا سفر

اس روز جب میں گوپال کے چیمبر میں بیٹھی ٹیبل پر بکھرے فائل درست کر رہی تھی۔ تبھی میری نظر فائل میں دبے ایک خط پر جا پڑی۔ گوپال کے نام خط شاید اس کے گھر سے آیا تھا۔ دل میں آیا کہ خط کھول کر ایک نظر اسے دیکھ لوں۔ لیکن ضمیر نے گوارہ نہیں کیا۔ دوسرے کا خط پڑھنا اچھا نہیں۔ مگر گوپال میرے لئے اب غیر کہاں رہا تھا؟ خط پڑھوں یا نہیں۔ میں اسی تذبذب میں تھی کہ چپراسی نے آکر بتایا۔

''سبودھ نام کا ایک شخص آپ سے ملنا چاہتا ہے!''

سبودھ کا نام سن کر میں الجھن میں پڑ گئی۔ اس کی یادوں کے کئی گوشے ایک دم سے آنکھوں میں تازہ ہو گئے۔ سبودھ میرے لئے کوئی اجنبی نہیں تھا۔ اس کے ساتھ میں نے دو چار دن نہیں کئی سال گزارے تھے اور اسے جی جان سے چاہا تھا۔ اس کی ذات سے میری اتنی یادیں وابستہ تھیں کہ جن میں کھو کر میں اپنا آپ کھو بیٹھی تھی۔ پر اب تو وہ سب ایک خواب سا لگتا ہے۔ بے معنی، بے مقصد، بھولی بسری کوئی کہانی، میں نے اسے ٹالنے کی غرض سے چپراسی سے کہہ دیا۔

''کہہ دو اس سے وہ کل آئے۔ اس وقت میں نہیں مل سکوں گی۔!''

کہنے کو تو میں نے کہہ دیا۔ مگر یہ بات خود مجھے اپنی سماعت پر ناگوار گزری۔ میں نے چپراسی کو رکنے کا اشارہ کیا اور کہہ دیا۔

''اسے میرے پاس بھیج دو......!''

''ٹھیک ہے بھیج دیتا ہوں!'' چپراسی بول کر چلا گیا۔

سبودھ سے میری دوستی کوئی نئی نہیں تھی۔ کالج کے دنوں میں سب سے پہلے میری جس لڑکے سے جان پہچان ہوئی وہ سبودھ تھا۔ میرا کلاس فیلو۔ بڑی دلنواز شخصیت تھی اس کی۔ گفتگو کا انداز، بولنے کا سلیقہ۔ اس کے ہونٹوں پر کھیلتی مسکراہٹوں میں چھپی میرے لئے جو چاہت اور تڑپ تھی۔ اس نے مجھے اپنا

گرویدہ بنالیا۔ دل میں پیار کی خواہش جاگ اٹھی اور سبودھ مجھے اچھا لگنے لگا۔

پھر تو کالج کی فضا اور رومان پرور ماحول میں ملاقاتوں کا ایسا سلسلہ رہا کہ جلد ہی ہم نے ایک دوسرے کے ساتھ جینے اور مرنے کا عہد کرلیا۔ اور زندگی کا سفر بڑا دلچسپ اور پرلطف ہو گیا۔

تبھی سبودھ کو یونیورسٹی کی جانب سے امریکہ جانے کے لئے میرٹ اسکالرشپ کا آفر ملا۔ مگر اسے کوئی خوشی نہیں ہوئی۔ وہ تو مجھ میں ایسا کھویا تھا کہ جدائی کے خیال سے ہی اس کے ہوش اڑ گئے اور اس نے امریکہ نہ جانے کا من بنالیا۔ لیکن میں نے اس کی ایک نہ چلنے دی اور اسے میرے اصرار پر امریکہ جانا پڑا۔

امریکہ سے اس کے خطوط برابر آتے رہے۔ میں بھی پابندی سے جواب دیتی رہی۔ وہ بڑی بے صبری سے میرے خط کا انتظار کرتا تھا۔ جب کبھی اسے خط لکھنے میں دیر ہوتی تو انتظار میں میرا بھی برا حال ہو جاتا۔ خطوں کا ایک سلسلہ تھا کہ دوریاں سمٹ کر رہ گئی تھیں اور ہمیں تنہائی کا کوئی احساس نہیں ستا رہا تھا۔

مگر اچانک نہ جانے کیا ہوا کہ میں نے اسے خط لکھنا بند کر دیا۔ اس کے کئی خطوط آجاتے تب میں کوئی جواب دے پاتی۔ وہ بھی آدھا ادھورا۔ بڑی بے دلی کے ساتھ۔ میرے اندر یہ تبدیلی کوئی دانستہ نہیں تھی۔ میں نے اپنے گرد مصروفیتوں کے ایسے جال بن لئے تھے کہ اسے خط لکھنے کے لئے وقت نکالنا مشکل ہو رہا تھا اور اس کی یادیں تھیں کہ خود بخود سمٹ کر کمزور پڑنے لگی تھیں۔ پر اتنے دنوں بعد اچانک سبودھ آگیا تو میں چاہ کر بھی خود کو اس سے ملنے سے روک نہ سکی اور لاشعوری طور پر چپراسی سے اسے اندر بھیج دینے کو کہہ دیا اور میں اس کے بارے میں سوچنے لگی۔

سبودھ کے امریکہ جانے کے کچھ ہی مہینوں بعد مجھے شہر کی ایک بدیشی کمپنی میں ایک خوبصورت سا جاب مل گیا تھا۔ اس کمپنی میں ایک اسٹینوگرافر کی جگہ خالی ہوئی تھی۔ میں نے مقدر آزمایا اور اس عہدے کے لئے چن لی گئی۔ کمپنی کا ڈائرکٹر گوپال بڑا محنتی اور مخلص نوجوان تھا۔ میں بھی ڈیوٹی کی پابند اور کام کی تئیں ذمہ دار تھی۔ میری اس سے گہری چھننے لگی۔ جلد ہی گوپال نے میری آنکھوں میں کئی خواب جگا دیئے اور میں زندگی کی ایک نئی راہ پر چل پڑی۔ جس پر ہم ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اتنی دور نکل آئے ہیں کہ پیچھے مڑ کر دیکھنا بھی میرے لئے ممکن نہیں رہا۔ اب تو وہی میرا سب کچھ ہے۔ میرا پیار، میری منزل، اس کی

ساری توجہ کا مرکز میں ہوں۔ وہ مجھے اپنا سمجھتا ہے۔ میری اداسی اس سے دیکھی نہیں جاتی۔ میں خوش ہوں ۔ بے حد خوش۔ خوشیوں کے اس موسم میں اب مجھے پچھلی کوئی بات یاد نہیں رہی۔ سبودھ کے ساتھ گزارے وہ دن اور رات۔ سب کچھ جیسے دھند میں لپٹ کر رہ گئے ہیں۔ میں نے تو گوپال کے اوپر اپنی ہر خوشی نچھاور کردی ہے۔ صرف اس کے ساتھ ست ہونا باقی رہ گیا ہے۔

حالانکہ سبودھ کو بھولنا میرے لئے آسان نہیں تھا۔ مگر نظروں سے دور رہ کر اس نے خود میری مشکل آسان کردی ہے۔ میں گوپال کے ساتھ جس کھلی فضا میں سانس لے رہی ہوں۔ سبودھ کو یہ فضا راس نہیں آئے گی۔ میں زندگی کی پتوار اس کے ہاتھوں میں تھما کر خود کو خوشیوں سے محروم رکھنا نہیں چاہتی۔ میں نے سبودھ کے خیالوں کو بھی ذہن سے پرے ہٹا دیا ہے۔ پر اب اتنے دنوں بعد وہ آیا ہے تو میں ملوں گی۔ صرف ان رشتوں کی بنا پر کہ میں نے اس کے ساتھ ایک دو پل نہیں کئی برس گزارے ہیں۔ پر یہ بھی طے ہے کہ اب وہ مجھ سے ملے گا یقیناً میری سرد مہری سے اس کی انا کو ٹھیس پہنچے گی۔ وہ میرے روکھے برتاؤ اور خشک رویے سے اوب کر دوبارہ مجھ سے ملنے کی ہمت نہیں کرے گا۔

ابھی میں سوچ ہی رہی تھی کہ سبودھ چمبر میں داخل ہوا۔ اس کی متلاشی آنکھیں جیسے ہی مجھ پر پڑیں ۔ اس کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ اس نے بڑے پیار اور گرم جوشی سے مجھے پکارا تھا۔

''ہیلو پریا۔ اچھی تو ہو۔؟''

''ہاں۔ سب ٹھیک ٹھاک ہے۔ تم کہو کیا حال ہے۔ امریکہ سے کب آئے۔؟ میں نے اسے سامنے پڑی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے پوچھ لیا۔

''کل ہی آیا ہوں۔ سوچا تھا اچانک تم سے ملنے کی خوشی ہی کچھ اور ہوگی۔ ویسے میرے آنے کا اندازہ تو تمہیں ہوگا۔!''

''تم پر تو انگریزوں کی صحبت کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا سبودھ! بالکل نہیں بدلے۔ وہی انداز اور وہی بے تکلفی۔ جن کے پیچھے میں بھاگتی رہی ہوں!'' میں نے پلٹ کر اس کا چہرہ دیکھا تو مجھے لگا جیسے میں اس سے جو کچھ کہنا چاہتی تھی بول نہیں پائی۔ میرے چہرے پر بے اطمینانی کی جھلک دیکھ کر اس نے پوچھ لیا۔

''میرے یہاں آنے سے تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟''

''تکلیف کیسی؟ بھلا اپنوں سے بھی کوئی ایسا پوچھتا ہے کیا؟''

''تم سے ملنے کی آرزو میں میں نے یہ دن کیسے کاٹے ہیں پریا، تم نے پوچھا تک نہیں؟''

''بولو کیا لو گے۔ چائے چلے گی یا ٹھنڈا منگواؤں!'' میں نے بے اعتنائی برتنے کی کوشش کی۔ مگر نہ جانے کیسے لہجہ بدل گیا اور بے رخی کی جگہ اپنائیت نے لے لی۔

''کیا ہم کہیں اور چل کر چائے نہیں پی سکتے؟'' اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ اس کے اس سوال نے مجھے عجیب کشمکش میں ڈال دیا۔ جب مجھے یہ رشتہ توڑنا ہی ہے تو کیا فائدہ ایسی باتوں سے۔ جن سے سبودھ کے من کو بڑھاوا ملے۔ میں نے بلا جھجک اس سے کہہ دیا۔

''اس وقت تو ایسا ممکن نہیں۔ جب تک بوس نہیں جاتے میں آفس نہیں چھوڑ سکتی!''

''آخر کیوں؟''

''اب تمہیں کیا بتاؤں۔ تم تو خود سمجھدار ہو۔!''

''تو پھر ایسا کرو کہ چھٹی کے بعد ڈائنا ریسٹورنٹ چلی آنا۔ میں چھ بجے تمہارا انتظار کرونگا''

''آج شاید میں نہیں آسکوں۔ لیکن اگر موقع ملا تو!'' میں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''تم یہ کیسی باتیں کر رہی ہو پریا۔ تمہیں تو میرے بغیر چین نہیں ملتا تھا۔ اب تمہارے بغیر میرا کیا ہوگا۔؟''

''تم سمجھتے کیوں نہیں سبودھ! مجھ پر آفس کی بھی کچھ ذمے داریاں ہیں۔ میری مجبوریوں کا خیال کرو۔!''

''ایسی نوکری کی کیا ضرورت تھی پریا۔ جو تمہیں کسی کا غلام بنا دے؟''

''مجھے اب اور مت ستاؤ سبودھ۔ میرا سر چکرا رہا ہے۔ کہیں دم نہ گھٹ جائے!''

''میں جا رہا ہوں پریا۔ لیکن موقع ملے تو آجانا۔ میرے دل کا دروازہ تمہارے لئے ہر وقت کھلا ہے۔ جب بھی آؤ گی۔ مجھے اپنا منتظر پاؤ گی۔!''

وہ مایوس اور اداس سا جانے کو اٹھ کھڑا ہوا۔ میں چپ رہی۔ مجھے لگا جیسے میری باتوں سے اسے بڑی تکلیف پہنچی ہے۔ پر اس کے دکھ نے مجھے کیوں بے چین کر دیا ہے۔ میں نے تو اس سے ہٹ کر ایک

الگ راہ چن لی تھی۔ پھر بھی میں اس سے ملنے سے خود کو روک کیوں نہیں پائی۔ اس سے مل کر تو لگتا ہے کہ میں نے جسے بھولنے کی کوشش کی تھی۔ اب اس سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جائے گا۔

مجھے اپنی ہی سوچ پر ہنسی آگئی اور میرا دھیان ٹیبل پر رکھے اس خط کی طرف چلا گیا۔ جو گوپال کے نام شاید اس کے گھر سے آیا تھا۔ میری بے چینی بڑھ گئی اور میں نے خط اٹھا لیا۔ چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ چیمبر میں میرے سوا کوئی اور نہیں تھا۔ پھر بھی خط کھولتے ہوئے میرے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اور ذہن میں دفتر کی اس پرانی خادمہ کی وہ بات یاد آرہی تھی جو وہ ایک روز اپنے ملازم شوہر کو رازدارانہ طور پر بتاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''گوپال تو کئی بچوں کا باپ ہے۔ کہیں پریا اس کے جھانسے میں آکر اپنی عزت نہ گنوا بیٹھے!'' میں ان کی باتیں سن کر بھی کوئی مطلب نکال نہیں پائی تھی۔ لیکن نہ جانے کیوں من میں ایک وسوسہ سا ابھر آیا تھا اور ذہن پر اندیشہ کی ایک پرت سی جم گئی تھی۔ میں نے کئی بار اس بات کو گوپال کے سامنے رکھنے کی کوشش بھی کی۔ پر موقع ہی نہیں ملا۔ حالانکہ جب گوپال کی نظروں نے پہلی بار میرے دل پر دستک دی تھی تو میں نے کواڑ کھولنے سے پہلے اپنا اطمینان کر لیا تھا اور اس کی جانب قدم بڑھانے سے پہلے اس کی زندگی کے تمام پہلوؤں کو ٹٹول چکی تھی۔ وہ قابل بھروسہ آدمی تھا۔ اس کی نیت بھی صاف تھی۔

لیکن آج جیسے سب کچھ الٹ پلٹ کر رہ گیا تھا۔ خط کا ایک ایک لفظ میرے ذہن میں نشتر کی طرح چبھنے لگا۔ گوپال کے کسی بہی خواہ ملازم نے اس کی بیوی کو خبردار کرتے ہوئے اس کے کانوں تک یہ بات پہنچا دی تھی کہ گوپال دفتر کی ایک خوبصورت اسٹینوگرافر کے چکر میں اپنی کمائی لٹا رہا ہے۔ کہیں اس کا یہ پیار تمہاری دنیا اجاڑ کر نہ رکھ دے۔

شاید اسی ڈر سے اس کی بیوی نے شام کی گاڑی پکڑنے کی اطلاع دیتے ہوئے گوپال کو ہدایت دی تھی کہ وہ صبح اسے لینے گاڑی لے کر اسٹیشن پر موجود رہے۔

میں سُن ہو کر رہ گئی۔ انجانے میں گھڑی پر نظر جا پڑی۔ چھ بجنے ہی والے تھے۔ میں نے باہر آ کر ٹیکسی پکڑی اور ڈرائیور سے ڈائنا ریسٹورنٹ چلنے کو کہہ دیا۔

ہارے کارگل کی جیتی جنگ

وہ چاہے جسے اپنائے اس کا فیصلہ اپنے پیچھے دکھ بھری ایک لمبی داستان تو چھوڑ ہی جائے گا اور یہی ایک تلخ حقیقت تھی جو بار بار اس کے ذہن میں گھوم کر اس کی بے چینی کا سبب بنی ہوئی تھی۔

''اپنے دونوں شوہروں میں سے تم جس کے ساتھ رہنا چاہو۔ رہ سکتی ہو۔ تمہارا فیصلہ سب کے لئے قابلِ قبول ہوگا۔!''

لیکن فرزانہ کے لئے یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو رہا تھا کہ وہ کس کے ساتھ رہے اور کس کا ساتھ چھوڑے۔ ایک طرف عابد تھا۔ جس کے پیار کی خوشبو اس کی سانسوں میں بسی تھی۔ دوسری جانب تحسین۔ جس کا پیار اس کے وجود میں سانس لے رہا تھا۔

فرزانہ اتر پردیش کے منڈلی نامی گاؤں کی رہنے والی تھی۔ کاشتکاری اس کے گھرانے کا آبائی پیشہ تھا۔ پیار سے لوگ اسے گڈی کہتے تھے۔ تحسین کے ساتھ اس کی دوبارہ شادی تب ہوئی تھی جب کارگل کی جنگ کو ختم ہوئے پانچ سال پورا ہونے میں کچھ ہی مہینے باقی تھے۔ کارگل کو لے کر ہندو پاک کے درمیان بڑی خوں ریز جنگ ہوئی تھی۔ مگر اب دور تک نہ تو فضاؤں میں جنگ کے آثار تھے اور نہ لوگوں کے چہرے پر خوف کی جھلک۔ دشمنی کی جگہ پیار و محبت نے لے لی تھی۔ باہمی اعتماد اور رواداری کے جذبے نے لوگوں کے خیالات بدل ڈالے تھے۔ انہیں احساس ہو گیا تھا کہ جنگ سے کچھ حاصل نہیں۔ ملک کی خوشحالی کے لئے امن ضروری ہے اور کارگل کی جنگ تاریخ کا ایک حصہ بن کر رہ گئی تھی۔

لیکن اس جنگ نے فرزانہ سے عابد کو چھین کر اسے جو دکھ دیا تھا اس کے گھاؤ ابھی بھرے نہیں تھے۔ البتہ تحسین کے ساتھ رشتہ جوڑنے کے بعد اس کا اثر کچھ ماند ضرور ہوا تھا۔

عابد کے ساتھ فرزانہ کی شادی کو محض دس دن ہی گزرے تھے کہ عابد کو کارگل کی لڑائی پر جانا پڑا۔ وہ اتر پردیش کے میرٹھ کا رہنے والا تھا۔ برسوں پہلے فوج میں اس کی بحالی ہوئی تھی اور وہ ایک سپاہی

کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دے رہا تھا کہ کارگل میں جنگ چھڑ گئی اور اسے محاذ پر بھیج دیا گیا۔

میدان جنگ میں بھی اس نے اپنی جواں مردی کے خوب جوہر دکھائے اور اپنی پیش قدمی جاری رکھی۔ لیکن اس روز جب وہ دشمنوں سے برسرِ پیکار تھا۔ نہ جانے کب اور کہاں اس سے ایسی بھول ہوگئی کہ وہ دشمنوں کے نرغے میں پھنس گیا۔ اسے ہتھیار ڈالنے پڑے اور وہ جنگی قیدی بنا کر کسی نامعلوم مقام پر بھیج دیا گیا اور پھر دنیا اس کے حال سے بے خبر ہوگئی۔

جنگ ختم ہوئے عرصہ گزر گیا اور سرحد کی دونوں جانب حالات سازگار ہو گئے۔ مگر عابد کی گمشدگی ایک معمہ بنی رہی۔ البتہ ابتدائی چھان بین کے بعد فوجی افسروں نے عابد کو بھگوڑا قرار دے دیا۔ جس کے باعث رسوائی اس کا مقدر تو بنی ہی۔ اس کے گھر اور سسرال والوں کو بھی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ کہیں سر اٹھا کر جینے کے لائق نہیں رہے۔ اسی صدمے کی تاب نہ لا کر عابد کی ماں چل بسی۔

حالانکہ فرزانہ کے والد کمال الدین نے اپنے طور پر عابد کی کھوج خبر لینے میں کوئی کثر نہیں چھوڑی۔ اس کی تلاش کے سارے حربے استعمال کر ڈالے۔ خود عابد کے والد کی جانب سے بھی اس کی خبر دینے والے کو لاکھوں روپے انعام دینے کا اعلان ہوا۔ مگر سب بے سود۔ نہ عابد کے زندہ رہنے کا کوئی سراغ ملا اور نہ ہی اس کے مرنے کی تصدیق ہوسکی۔

پھر بھی تلاش کا سلسلہ بند نہیں ہوا۔ سیاسی اور سفارتی سطح پر بھی دونوں ممالک کے درمیان بات چیت ہوتی رہی اور ڈیپارٹمنٹل تحقیقات میں بھی افسران جٹے رہے۔ مگر نتیجہ کچھ نہیں نکلا۔ تو عابد کی طرف سے ناامید ہو کر سب نے اسے مردہ سمجھ لیا۔

فرزانہ نے جوانی کے شعور کو چھوا ہی تھا کہ عابد کے ساتھ بیاہ دی گئی۔ مگر خوشیوں کے یہ لمحے دیر پا ثابت نہیں ہوئے۔ محض دس دنوں کا ساتھ رہا اور زندگی فرزانہ کو اس موڑ پر لے آئی جہاں کبھی کبھی عورت کو اپنے وجود پر بھی شرمندگی کا احساس ستانے لگتا ہے۔ مگر یہ تو قدرت کا فیصلہ تھا۔ جس کی مرضی کے آگے کسی کا زور نہیں چلتا۔ فرزانہ کے اس دکھ پر سب کے من دکھی تھے اور سب یہی چاہتے تھے کہ کسی طرح فرزانہ کی دوبارہ شادی ہو جائے تا کہ اس کی آئندہ زندگی کو اعتبار مل سکے۔

اتفاق سے پاس کے ہی ایک گاؤں سے فرزانہ کے لئے پیام آگیا۔ تحسین برسرِ روزگار انجینئر

تھا۔شکل وصورت بھی اچھی تھی اور گھرانہ بھی ہم پلہ اوران کے معیار کا تھا۔بات طے ہونے میں دیر نہ لگی
اور جلد ہی دونوں ایک دوسرے کے جیون ساتھی بن گئے اور زندگی کا ایک سفر شروع ہو گیا۔

اب فرزانہ کے لئے تحسین ہی اس کا سب کچھ تھا۔اس کی زندگی،اس کا سرمایۂ حیات، تحسین
نے بھی اسے اتنا پیار دیا،ایسی اپنائیت جتائی کہ اس کی ساری کائنات اس کی ذات میں سمٹ کر رہ گئی اور
پھر گزرتے وقت کے ساتھ عابد کی یادیں بھی دھندلاتی چل گئیں۔

زندگی میں ہر سو خوشیاں بکھری تھیں۔دور تک اجالا پھیلا تھا۔زندگی بڑی پرسکون گزر رہی تھی
کہ اچانک ایک روز فرزانہ کی قسمت کے ستارے گردش میں آگئے اور وہ ایک ایسے المناک حادثے سے
دوچار ہوگئی۔جس نے اس کے سارے وجود میں چنگاریاں سی بھر دیں۔

جنگ کی گھٹا برس کر تھم چکی تھی۔دوستی کے نئے دور کا آغاز ہو چکا تھا اور سب کچھ بھول کر دونوں
ممالک ایک دوسرے کے قریب آگئے تھے۔تبھی دوستی اور خیر سگالی کے جذبے کو اور بڑھاوا دینے کے نام
پر بچے کھچے ان دو جنگی قیدیوں کی رہائی بھی عمل میں آگئی۔جو برسوں سے پاکستان کی جیلوں میں قید و بند
کی صعوبتیں جھیل رہے تھے۔ان میں ایک جالندھر کا رگھبیر سنگھ تھا اور دوسرا کارگل کے میدان کارزار سے
لاپتہ عابد۔انہیں بڑی عزت اور احترام کے ساتھ ہندوستان بھیج دیا گیا۔

عابد کے لوٹ آنے کی خبر سن کر فرزانہ مبہوت رہ گئی۔

عابد بھی عجب کشمکش میں پڑ گیا۔یہ اس کی زندگی کا ایک المیہ ہی تھا کہ فرزانہ اس کی زندگی سے
دور جا چکی تھی۔جس کی آس میں اس نے جیلوں میں پانچ سال کاٹ لئے۔بن باس کا لمبا دکھ جھیل لیا۔وہ
اسے ایک دم سے کیسے بھول جاتا۔زندگی کی لڑائی جیت کر اسے جو خوشی ہوئی تھی فرزانہ کو ہارنے کا غم اس
سے بھاری تھا۔اس کا بے چین من فرزانہ کو پانے کے لئے اور بھی بے قرار ہو گیا۔

عابد کی واپسی نے پورے شہر کا دھیان اپنی طرف کھینچ لیا تھا۔فرزانہ کے سامنے بھی ایک نئی
صورت حال پیدا ہو گئی۔نازک اور بے حد پیچیدہ مسئلہ تھا۔بات گھر کی حدوں سے نکل کر سماج اور
گاؤں والوں کے درمیان آگئی اور سب مفاہمت کی کوئی راہ نکالنے میں جٹ گئے۔

حالانکہ یہ اپنی نوعیت کا کوئی پہلا واقعہ نہیں تھا۔ماضی میں جب بھی اس طرح کا کوئی تنازعہ منظر

عام پر آیا ہے۔شرعی قوانین کے مطابق اس کا حل ڈھونڈ نے میں لوگوں کو کوئی پریشانی نہیں ہوئی ہے۔

فرزانہ کے معاملے کو لے کر بھی کئی دینی اداروں کے مفتیوں سے فتوے منگوائے گئے اور ابھی شہر کے علما کرام سے صلاح ومشورہ جاری ہی تھا کہ میڈیا والوں نے بات اچک لی۔

پرنٹ میڈیا ہو یا الکٹرانک میڈیا۔نیا کچھ کر دکھانے کی چاہ میں وہ اپنی حد سے بھی گزر جاتے ہیں۔اپنی برتری ثابت کرنے میں کوئی کسی سے پیچھے نہیں رہتا۔پرنٹ میڈیا نے اپنے اپنے طور پر اس واقعہ کی خوب تشہیر کی اور اسے ایک دم سے اخبار کی سرخیاں بنا ڈالا۔ٹیلی ویژن کے مختلف چینلوں نے بھی اسے عالمی سطح پر اچھالنے کی پوری کوشش کی۔عابد و تحسین کے ساتھ فرزانہ کو بھی ان کے گھروں سے اٹھا کر اسٹیڈیو لے آئے۔انہیں نو ماہ کی حاملہ فرزانہ کی حالت پر بھی ترس نہیں آیا اور اسے لوگوں کے روبرو پیش کر کے ایک تماشہ بنا ڈالا۔ایسا تماشہ جس سے خود تو لطف اندوز ہوتے ہی رہے اوروں کی دلچسپی کا بھی ایک سامان فراہم کر دیا۔۔سیدھے سادے لوگ میڈیا کے ہاتھوں کے کھلونا بن گئے۔

حالانکہ تحسین کے ساتھ فرزانہ کے رشتے میں کوئی خامی نہیں تھی۔سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا۔ لیکن عین شادی کے موقع پر کچھ ایسی بھول ہوگئی کہ عابد کو دعوے کا ایک جواز مل گیا۔جس کو لے کر خواتین کی کئی تنظیموں نے خوب واویلا مچایا۔سب کا رویہ مخالفانہ تھا۔کیوں نہ ہوتا۔معاملہ تو فرزانہ کا تھا۔عابد و تحسین کے معاشرے اور ان کے ضابطۂ حیات کا تھا۔جن کی تضحیک کا کوئی موقع وہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔

میڈیا والوں کی بے جا مداخلت اور ان کے چبھتے ہوئے سوالوں سے جب عابد اور تحسین کے جذبات مجروح ہونے لگے اور فرزانہ کو بھی اپنی ناقدری کا احساس ہوا تو ان کے گھر والوں نے سب پر یہ بات واضح کر دی کہ اس معاملہ میں نہ تو وہ کسی کی بات مانیں گے اور نہ ہی کسی دباؤ کے آگے جھکیں گے۔وہ وہی کریں گے جو شریعت کا فیصلہ ہوگا اور جلد ہی اس معاملے کا حل ڈھونڈ لیا گیا۔

عابد و تحسین کی موجودگی میں ان کے گھر والوں نے فرزانہ کو اپنی راہ چننے کا اختیار دے کر سارا معاملہ اس کی مرضی پر چھوڑ دیا۔

"اپنے دونوں شوہروں میں سے تم جس کے ساتھ رہنا چاہو۔رہ سکتی ہو۔تمہارے فیصلے کا بھی

احترام کریں گے۔!''

زندگی کی یہ تلخ حقیقت جس کا سامنا کرتے ہوئے فرزانہ گھبرا رہی تھی مگر اسے تو فیصلہ کرنا ہی تھا۔ چاہے جس کے حق میں کرے۔ سو اس نے وہی کیا۔

جس کی شریعت نے اسے اجازت دی۔

عابد کے پیار کے آگے وہ بے بس اور مجبور ہو گئی!

آگے راستہ بند ہے

راجو بھیا کا دم ٹوٹ چکا تھا اور لاش سڑک کے کنارے فٹ پاتھ پر پڑی تھی۔ آناً فاناً پورے شہر میں یہ بات پھیل گئی کہ راجو بھیا کو پولس نے بلا وجہ موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ لوگوں کے دلوں میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی اور نفرت کا جذبہ ابھر آیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے فٹ پاتھ دکانداروں کی بھاری بھیڑ لاش کے گرد جمع ہو گئی۔

فٹ پاتھ والوں کے ساتھ پولس کی یہ زیادتی کوئی نئی بات نہیں تھی۔ آئے دن ایسا ہوتا رہتا تھا کہ کبھی پھل اور سبزیاں بیچنے والوں کو سڑک جام کرنے کی پاداش میں پولس کی مار سہنی پڑتی تھی تو کبھی جوتے چپل اور لنگی گنجیاں بیچنے والوں کو راستہ صاف کرنے کے بہانے پولس کے ڈنڈے کھانے پڑتے تھے۔

یہ تو سب ہی جانتے تھے کہ پولس کی مدد سے ہی ضرورت مند بے روزگاروں کو اپنا دھندا چلانے کے لئے سڑک کے کنارے فٹ پاتھ پر جگہ ملتی تھی۔ جس کا فائدہ دکانداروں کے ساتھ پولس والوں کو بھی ملتا تھا۔

ٹرافک پولس بٹ کے نام پر روزانہ ان سے پیسے وصولتی تھی۔ تھانے والے الگ سے ہفتہ وصولنے آجاتے اور ریلوے پولس بطور مہینہ ہر ماہ ان سے اچھی خاصی رقم بٹور لے جاتی تھی۔ پھر بھی ان فٹ پاتھ دکانداروں کا کوئی پرسان حال نہیں۔ انہیں ہمیشہ ذلت اور پریشانیوں کا ہی سامنا کرنا پڑتا تھا۔

یہ الگ بات تھی کہ جب بھی پولس کا کوئی بڑا افسر شہر کے دورے پر آتا تھا یا محکمے کی جانب سے خاص چیکنگ چلتی تھی تو فٹ پاتھ والوں کو اس کی جانکاری پہلے سے مل جایا کرتی تھی۔

اس کے باوجود اگر کسی نے دکان لگالی تو اسے پولس کی جھڑکیاں بھی کھانی پڑتی تھیں اور مال کا نقصان بھی اٹھانا پڑتا تھا۔

فٹ پاتھ دکانداروں میں راجو بھیا ہی کچھ پڑھا لکھا اور سوجھ بوجھ والا تھا۔ اس نے روز روز کی

پریشانیوں سے دکانداروں کونجات دلانے کے لئے فٹ پاتھ والوں کی ایک کلیان سمیتی بنائی تھی۔جس کا کنوینر لوگوں نے متفقہ طور پر اسے ہی بنایا تھا۔اس نے کام کاج کے دوران ایسی حکمت عملی اپنائی جس سے نہ تو کسی دکاندار کو بے جا پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا اور نہ کسی کو اس کی جگہ سے بلاوجہ ہٹانے کی ہمت ہوئی۔لوگ اسے بہت چاہتے اوراس کی ہر بات ماننے کو تیار رہتے تھے۔

راجو بھیا پچھلے کئی سال سے فٹ پاتھ کی کمائی پر جی رہا تھا۔اس نے بھی اوروں کی طرح فٹ پاتھ سے سٹی ریلوے کی خالی پڑی زمین پر بانس کے کھمبوں کے اوپر ترپال ڈال کر ایک دکان بنالی تھی۔جس میں وہ جوتے، سینڈل اور رنگ برنگ کی ہوائی چپلیں بیچا کرتا تھا۔اس کے مال کی کوالیٹی اچھی ہوتی تھی اور دام بھی مناسب۔گاہکوں کے ساتھ اس کا برتاؤ بھی کچھ ایسا تھا کہ لوگ اس کے یہاں مال خریدنا زیادہ پسند کرتے تھے اوراس کا کاروبار پھل پھول رہا تھا۔

لیکن جب سے شہر میں تجاوزات ہٹاؤ مہم کا آغاز ہوا تھا۔فٹ پاتھ کے دکانداروں میں ایک کھلبلی سی مچی ہوئی تھی۔عام دکاندار اور مالک مکان سہمے ہوئے تھے کہ معلوم نہیں تجاوزات ہٹاؤ ابھیان کے تحت کس کی دکان اجڑے گی۔کون سی عمارت کا حلیہ بگڑے گا۔کس مکان کے دروازے اور سائبان ٹوٹینگے۔

ایک روز ایسا ہوا کہ اچانک میونسپل کارپوریشن کے کچھ بڑے افسران شہر کی اہم شاہراہوں کا جائزہ لینے آگئے۔ان کے ہمراہ سرکاری امین بھی تھے اور پرانے سروے رپورٹ کی کاپیاں بھی۔پہلے تو انہوں نے ریلوے اسٹیشن کے آس پاس کی سڑکوں کی پیمائش کا کام شروع کیا۔پھر دن بھر سڑکوں کے کنارے غلط ڈھنگ سے بنی عمارتوں اور دکانوں کونشان زد کرتے رہے۔دوسرے دن بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔کئی روز لگ گئے تب کہیں جاکر سروے کا کام مکمل ہوا۔

لوگوں کوامید تھی کہ میونسپل کارپوریشن والے پہلے مکان مالکوں اوردکانداروں سے کہیں گے کہ وہ سرکاری زمین پر غلط ڈھنگ سے بنی اپنی دکانیں اور عمارتوں کی اپنے حد سے نکلے ہوئے چھجے اور سائبان خود ہی ہٹالیں۔ورنہ نالے پر سے گمٹیاں ہٹانے اور ناجائز حصوں کو توڑنے کے لئے کارپوریشن کے ملازم آئینگے تو دکانداروں کا ہی زیادہ نقصان ہوگا اور مکان مالکوں سے ہرجانے بھی وصول کئے جائینگے۔

مگر ہوا ان کی سوچ کے برعکس۔

سروے کا کام پورا ہوئے ابھی ہفتہ بھی نہیں گزرا تھا کہ اچانک ایک صبح بنا کوئی نوٹس دیئے کارپوریشن کے اعلیٰ افسروں کے ساتھ پولس والے بھی آ گئے۔ ان کے ہمراہ کارپوریشن کے ملازمین اور روزانہ کی اجرت پر کام کرنے والے مزدور بھی تھے۔

سب سے پہلے پولس نے علاقے کی گھیرابندی کر دی اور پھر افسروں کے حکم پر ملازمین اور مزدوروں نے نشان زدہ مکان کی دیواروں اور دکان کے ناجائز سائبانوں کو توڑنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ لوگ خوف اور دہشت کے مارے سب کچھ دیکھتے اور سنتے رہے۔ کسی کو کچھ بولنے اور پوچھنے کی جرائت نہیں ہوئی۔ سب اداس اور غمزدہ چہرہ لئے ادھر اُدھر دوڑتے اور بھاگتے رہے لیکن جب بچاؤ کی کوئی صورت نظر نہیں آئی تو دکانداروں نے خود ہی سب کچھ حالات کے رخ پر چھوڑ دیا اور کنارے ہو گئے۔

لوگ جانتے تھے کہ جہاں انتظامیہ کا بڑا افسر خود تجاوزات ہٹاؤ مہم کی نگرانی کر رہا ہو وہاں اس کے کسی ماتحت افسر سے یہ کیسے امید کی جا سکتی تھی کہ وہ کسی کو ایسی رعایت دے گا جس سے اس مہم کی خلاف ورزی ہوتی ہو۔

فٹ پاتھ والے بھی اپنے سامان سمیٹنے میں لگ گئے۔ پھل والے اپنی ٹوکریاں لے کر بھاگے، سبزی فروش سبزیاں چھوڑ کر بھاگے، خوانچے اور پھیری والے جدھر سینگ سمایا ادھر ہی چل دیئے۔ مگر جوتے چپل والوں کے لئے تو مصیبت کی گھڑی تھی۔ دکان سمیٹنا آسان نہیں تھا۔ کسی طرح راجو بھیا نے بھی اپنے سامان چٹائیوں سے ڈھکے اور تماشائیوں کی بھیڑ میں شامل ہو کر دکان کی رکھوالی کرتے رہے۔

کئی گھنٹوں تک توڑ پھوڑ کا سلسلہ جاری رہا۔ لیکن جب کارندے ریلوے کی زمین پر بنی جھوپڑیاں اکھاڑنے آئے تو انہیں بھاری مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ دکانداروں کو شکایت تھی کہ ناپ جوکھ میں جانب داری سے کام لیا گیا ہے۔ دبنگوں اور تعلقات والوں کے ساتھ رعایت برتی گئی ہے۔ مگر کارپوریشن والوں نے اسے ان کا جھوٹا پروپگنڈا اور غلط بیانی کہہ کر سرے سے ہی ان کی شکایتوں کو نظر انداز کر دیا اور مزدور توڑ پھوڑ کے اپنے کاموں میں جٹے رہے۔ سرکاری زمین پر سے ناجائز قبضہ ہٹانے کے لئے بل ڈوزروں نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ سڑک کی دونوں جانب بل ڈوزر اپنا منھ پھیلائے دوڑتے

رہے اوران کی راہ میں جو کچھ آیا نگلتے چلے گئے۔

راجو بھیا اس فکر میں تھا کہ توڑ پھوڑ کی یہ کارروائی ذرا تھمے تو وہ بھی اپنے سامان سمیٹ لے جائے۔ مگر سامنے سڑک کے اس پار کچھ مزدور ایک عمارت کی چھت پر چڑھے اس کے چھجے ڈھا رہے تھے اور نیچے سڑکوں پر اینٹ اور پتھر کے ٹکڑے گر گر ادھر ادھر چھٹک رہے تھے۔ جس سے کئی راہگیروں کو چوٹیں آئیں اور لوگ غصے میں آ کر بھڑک اٹھے۔ تبھی کسی نے ریلوے کی منہدم دیوار کی اوٹ سے پولس پر گولی چلادی۔ جواب میں پولس کو بھی گولیاں چلانی پڑیں۔ جن سے ہر طرف خوف وہراس کے بادل چھا گئے۔ اس افراتفری میں نہ جانے کیسے ایک گولی راجو بھیا کو آ لگی اور پیٹ کو چھیدتی ہوئی پار نکل گئی۔ اور اس نے وہیں سڑک کے کنارے گر کر دم توڑ دیا۔ لوگوں نے اس کی چیخ سنی اور بھاگتے ہوئے سب اس کے قریب آ گئے اور راجو بھیا کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔

مگر راجو بھیا مر چکا تھا۔ لوگ اس بات کو لے کر بہت دکھی اور بھاری صدمے میں تھے کہ پولس والوں نے مفت میں اس کی جان لے لی۔

سمیتی والوں نے بھی راجو بھیا کے اہل خانہ سے ہمدردی جتانے اور پولس کے خلاف اپنے غصے کے اظہار کا ایک وسیلہ ڈھونڈ نکالا اور بازار بند کا نعرہ دے کر عام لوگوں سے اس ہڑتال میں شامل ہونے کی اپیل کر دی۔ اور پھر لاش کو کھاٹ پر رکھ کر اسے کاندھے سے اٹھائے شہر کی اہم سڑکوں میں گھمانے نکل پڑے۔ آگے آگے لاش تھی اور پیچھے پیچھے لوگوں کا ہجوم۔ فضا سرکار مخالف نعروں سے گونج رہی تھی اور ماحول میں تناؤ بنا ہوا تھا۔

ہڑتال کی خبر پھیلتے ہی لوگوں نے خود ہی اپنی اپنی دکانیں بند کر لیں۔ اسکولی لڑکے بھی کلاسوں سے نکل کر سڑکوں پر آ گئے اور ہڑتالیوں کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ جب سارے کاروبار ٹھپ پڑ گئے تو لوگوں نے راجو بھیا کی لاش اسٹیشن کے سامنے بیچ چوراہے پر رکھ دی اور تمام راستے جام کر ڈالے۔

دیر تک پولس تماشائی بنی سب کچھ دیکھتی، سنتی اور سہتی رہی۔ تشدد پر آمادہ بھیڑ کو چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا۔ لیکن جب آس پاس کے تھانوں سے کئی گاڑیوں میں لد کر پولس کے جوان آ گئے اور اپنے مورچے سنبھال لئے تو کمک کے انتظار میں کھڑی پولس بھی حرکت میں آ گئی۔

پہلے تو پولس افسروں نے مجمع کو بہلا پھسلا کر جام ہٹانے کی کوشش کی۔ مگر مجمع کا رخ اچھا نہیں تھا۔ لوگ اڑیل رویہ اپنائے ہوئے تھے۔ ان کی ایک ہی مانگ تھی کہ جب تک مکھ منتری جی نہیں آجاتے ہم لاش اٹھانے نہیں دینگے۔ افسروں نے بہت سمجھایا بجھایا۔ معاوضے کی پیشکش کی اور اس بات کا بھی یقین دلایا کہ ان کے جذبات سے مکھ منتری کو آگاہ کر دیا جائے گا۔ مگر مجمع ٹس سے مس نہ ہوا۔ حالانکہ لوگ سرگوشیوں میں اس پیشکش کو قبول کرنے کا مشورہ بھی دے رہے تھے۔ مگر مرنے مارنے پر آمادہ اس بھیڑ کو کوئی کیسے سمجھاتا کہ اگر سمیتی والوں نے اس پیشکش کو ٹھکرادیا تو...... راجو بھیا کے بال بچوں کو جو کچھ ملنے والا ہے وہ بھی نہیں ملے گا۔ الٹے دکانداروں کو ہرہمت اٹھانی پڑے گی۔ پولس والوں کا کیا جب سارا انتظامیہ ایک طرف ہو تو انہیں الٹے سیدھے مقدموں میں پھانس کر جیلوں میں ٹھوسنا پولس کے لئے کون سی بڑی بات ہوگی۔

مگر جوش میں ہوش کی بات کون سنتا ہے۔ سمیتی والے اپنی ضد پر اڑے رہے۔ آخر کار پولس کو اپنی طاقت کا استعمال کرنا پڑا۔ اس نے اچانک لوگوں کو کھدیڑنا شروع کر دیا اور بھیڑ پر اندھا دھند ڈنڈے برسانے لگی۔ لوگ بدحواس ہو کر ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ جو جدھر بھاگا پولس ڈنڈے لے کر اس کے پیچھے دوڑی اور انہیں بازار کی حدوں سے نکال کر ہی دم لیا۔

بھاگنے والوں میں کچھ نے آگے جا کر مورچے سنبھال لئے اور وہیں سے درخت اور دیواروں کی آڑ لے کر ان پر اینٹ اور پتھر برسانے لگے۔ مگر پولس کے ڈنڈوں کے آگے ان کی ایک نہ چلی اور سبھی میدان چھوڑ کر بھاگ نکلے۔

پولس نے راجو بھیا کی لاش کو قبضے میں لے کر پوسٹ مارٹم کے لئے صدر اسپتال بھیج دیا اور ضابطے کی کاروائی مکمل کرنے لگی۔ مزدور صفائی کے اپنے کاموں میں جٹے رہے۔ شام دن بھر کے ہنگاموں کو سورج کی کرنوں کے ساتھ سمیٹ کر پرسکون ہوگئی اور چاندنی میں ڈھل کر حالات پوری طرح سنبھل گئے۔ تب رات کے سناٹے میں آہستہ آہستہ پولس بھی اپنے ٹھکانوں پر لوٹ گئی۔

لوگوں کو امید تھی کہ راجو بھیا کا خون ضرور رنگ لائے گا۔ مگر ہوا تو کچھ بھی نہیں۔ حالانکہ دوسرے دن بھی فٹ پاتھ والوں کی ہڑتال جاری رہی۔ لیکن ان کی ہڑتال کا نہ تو بازار پر کوئی اثر پڑا اور نہ عام زندگی

کسی طرح متاثر ہوئی۔

دوسرے دن کارپوریشن والے پولس افسروں کے ساتھ پھر آدھمکے۔ جوانوں نے پورے بازار کی ناکہ بندی کردی اور ایک ساتھ توڑ پھوڑ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

شاید راجو بھیا کی چیخ فٹ پاتھ کی فضاؤں میں ہی گم ہو کر رہ گئی۔

حسن رہبر اُردو دنیا کی ایک ایسی معتبر شخصیت کا نام ہے جن کے افسانے کی گونج اُردو دنیا کی نئی بستیوں میں بھی اپنی تازگی ، بے باکی اور انفرادیت کے لئے جانی اور پہچانی جاتی ہے۔

ان کے افسانوں میں جہاں زمانے کی تلخیاں، صلیب پر لٹکی ہوئی سچائی کا کرب اور اپنوں کی ستم ریزی کا ماتم ہے۔ وہیں زندگی کی رعنائیاں ، امنگوں کے کھلتے گلاب اور پھولوں کی پنکھڑیوں پر لرزتے شبنم کے قطروں کی کہانی بھی۔

ان کی تحریروں میں سماجی بصیرت اور لسانی ادراک کی توانائی یقیناً قاری کے ادبی ذوق کی تسکین فراہم کرے گا۔

انجینئر محمد ارشد شمیم
D-31, Abufazal Enclave
Jamia Ngar, Okhla
New Delhi - 110025

AAGE RASTA BAND HAI
(Short Stories)
By : Hasan Rahber

حسن رہبر کے بیشتر افسانوں میں جو آخری موڑ اُبھرتا ہے۔ وہ نہ صرف اس افسانہ نگار کی فنی بنت کاری کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے بلکہ کہانی کو انوکھا بنانے میں بھی مددگار ثابت ہوتا ہے۔ او۔ ہنری کے ہاں یہی تکنیک استعمال ہوئی تھی۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ حسن رہبر نے اس تکنیک کو بڑی نفاست سے برتا ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا

غور کیا جائے تو معاصر زندگی کی ناہمواریاں اور بے انصافیاں ان کرداروں اور ان کے گرد واقعات کے تانے بانے سے ابھرتی نظرتی آتی ہیں۔ حسن رہبر دردمندی اور فن کاری سے اپنے افسانے بنتے ہیں اور انہیں تجربے کے انوکھے پن سے دلکش اور توجہ طلب بنا دیتے ہیں۔

پروفیسر محمد حسن

رہبر کے افسانوں میں خاتمہ بڑے ہی فنکارانہ انداز میں سامنے آتا ہے۔ ان کے افسانوں کا اختتام دراصل ایک نقطۂ عروج پر ہوتا ہے جہاں پہنچ کر افسانے کی شدت تاثیر میں ایک نمایاں اضافہ ہو جاتا ہے۔ بیشتر افسانوں کے خاتمہ کی نفسیاتی اور جذباتی حیثیت ہوتی ہے۔ منٹو اور او۔ ہنری کی طرح رہبر بھی اپنے افسانوں کے اختتام کو تحیر خیز اور غیر متوقع بنا کر پڑھنے والوں کو ایک شدید ذہنی جھٹکا دینا چاہتے ہیں۔ ان کے بیشتر افسانوں کا خاتمہ اسی طرح کا ہے۔

پروفیسر حامد چھپروی

حسن رہبر کمال ہنرمندی سے کہانیاں بنتے ہیں کہ کوئی جھول نظر نہیں آتا۔ ان کے پاس خوبصورت زبان ہے اور افکار کی فراوانی، پھر کہانی کے لئے اور کیا چاہئے۔

ڈاکٹر رضوان احمد

حسن رہبر خوش نصیب فنکار ہیں کہ انہیں زہر سے تریاق بنانے کا فن آگیا ہے اور ان کے فن کو آفاقیت اور گیرائیت کی معراج مل گئی ہے۔

آذرا براہیم

BOOK CORPORATION